لاہور

ماہانہ

ادب دوست

مارچ ۲۰۰۷ء

مُدیر

اے۔جی جوش

ماہنامہ

ادب دوست

لاہور

جلد نمبر ۱۳ ● مارچ ۲۰۰۷ء ● شمارہ نمبر ۳

رجسٹرڈ ایل نمبر 117

پتہ برائے خط و کتابت

6-A-1 کپور تھلہ ہاؤس

لیک روڈ پرانی انارکلی لاہور

فون: 7241443

قیمت فی پرچہ 20 روپے ●●● سالانہ 200 روپے

ناشر اے۔ جی جوش نے رحمٰن شمس پرنٹرز آبکاری روڈ لاہور سے چھپوا کر 39 کمرشل زون

لبرٹی مارکیٹ گلبرگ III لاہور سے شائع کیا۔ فون: 5763143

اس شمارے میں

اداریہ

افغانستان اور عراق کے بعد ایران پر امریکہ کی طرف سے ممکنہ حملے کے خلاف عالم اسلام کے علاوہ ساری دنیا کے امن پسند لوگ اور خود امریکی عوام کی کثیر تعداد کی طرف سے احتجاج اور مخالفت کا شدید ردعمل سامنے آچکا ہے اور تادم تحریر جاری ہے۔ سپر طاقت ہونے کے زعم میں امریکہ کے موجودہ جنونی صدر جارج ڈبلیو بش کے جارحانہ عزائم اور ہٹ دھرمی کے نتیجہ میں اگر ایران پر امریکہ نے حملہ کرنے کی حماقت کی تو ہمارے وزیر خارجہ خورشید قصوری نے ٹھیک کہا ہے کہ اس کے انتہائی سنگین نتائج برآمد ہوں گے جو پوری دنیا کو بھگتنا پڑیں گے اور پاکستان بھی ان نتائج کی لپیٹ میں آسکتا ہے۔ چنانچہ ان بگڑتے ہوئے حالات کے پیش نظر صرف پاکستان کے نہیں بلکہ ساری دنیا کے ادیبوں اور دانشوروں سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ اپنے قلم کی آواز کو احتجاج بنا کر زبان خلق کو موجودہ امریکہ کے فرعون صدر کے کانوں کے لئے نقارہ خدا بنا دیں۔ اور وہ جو بھیانک کھیل کھیلنے کی تیاریاں کر رہا ہے اس سے باز رہے۔

اے.جی.جوش

قطعہ

جمہوری سبق ان کو پڑھانے کے بہانے
بن بیٹھے عراق اور فلسطین کے مامے
اس قوم کو آزادی کے ثمرات ملیں کیا
ہوں جس کے "حکمران" ہی امریکہ کے کامے

ولایت حسین حیدری

حمد

قادرِ مطلق ہے تُو، سب قدرتیں تیرے لیے
جھک رہی ہیں شش جہت میں گردنیں تیرے لیے

پستیاں میرے لیے سب رفعتیں تیرے لیے
میں ہوں مدت کے لیے سب مدتیں تیرے لیے

اعتراف کبریائی کی یہی معراج ہے
اچھی اچھی دو جہاں کی صورتیں تیرے لیے

میرا دل، میری نظر اس بات پر قادر نہیں
ورنہ ہر اک ذہن میں ہوں چاہتیں تیرے لیے

جسد خاکی چند میٹر کا فقط محتاج ہے
جبکہ تُو خالق ہے اس کا وسعتیں تیرے لیے

ہوش مندی کا تقاضا ہے محبت بانٹ لیں
اس لیے کہ سب کی سب ہیں حکمتیں تیرے لیے

لاکھ منکر ہو تری وحدانیت کا حیدری
اس کو لکھنا ہوں گی ساری مدحتیں تیرے لیے

اے جی جوشؔ

حمد

گناہ رب رحیم میرے
معاف کرنا کریم میرے

ہے تری رحمت پہ ناز مجھکو
تُو بخششوں سے نواز مجھکو

مجھے عطا شوقِ بندگی کر
تُو میری راہوں میں روشنی کر

سر آگے تیرے جو خم رہے گا
تو میرے دم میں بھی دم رہے گا

وہ راہ سیدھی دکھا دے مجھکو
تُو منزلوں کا پتہ دے مجھکو

نظر میری آفتاب کر دے
جو خار کو بھی گلاب کر دے

مجھے تو قلب سلیم دے دے
مجھے بھی عظمت عظیم دے دے

کرے وہ سجدہ یہ جوشؔ تجھکو
رہے نہ پھر کچھ بھی ہوش مجھکو

حسن عسکری کاظمی

نعتؐ

آپؐ کو ملتِ بیضا ہوئی پیاری ایسی
درد میں ڈوبی دعا لب پہ تھی جاری ایسی

اب کوئی آتشِ دوزخ کا نہ ایندھن ہو گا
چاہنے والوں کی تقدیر سنواری ایسی

ہم گنہگار کہاں اور کہاں شہر نبیؐ!
خوش ہوئے ہم کہ ہے تقدیر ہماری ایسی

یاد آیا تھا کہ آقا کے قدم تھے اس جا
سجدۂ شکر میں رقت ہوئی طاری ایسی

صبح دم تازہ ہوا صحن حرم میں آئی
کب گلستاں میں چلی بادِ بہاری ایسی

آپؐ کی زلف معنبر ہے لجامِ حسنینؑ
اب سوار ایسے کہاں اور سواری ایسی

ہم کو اے کاش کبھی عہد نبوت ملتا
ایک حسرت ہے عبث عمر گزاری ایسی

اپنی امت سے محبت کا تقاضا تھا حسنؔ
ورنہ بخشش کے لیے گریہ و زاری ایسی

ڈاکٹر محمد رفیق

نعت رسول مقبولؐ

رکھتے نہیں ہیں زر مگر زر دار آپؐ ہیں
سب رفعتوں کے آپ ہی کوہسار آپؐ ہیں

نقش قدم ہے آپؐ کا تقلید کے لیے
ہر امتی کے واسطے معیار آپؐ ہیں

سب انبیاء میں آپؐ کا اعلیٰ مقام ہے
فخر رسل ہیں آپؐ ہی سرکار آپؐ ہیں

ظلمت چھٹی ہے آپؐ کے نور حیات سے
اس روشنی کا مرکز و مینار آپؐ ہیں

اب بھی ہے فیض آپؐ کا جاری اسی طرح
اک پردہ وصال میں بیدار آپؐ ہیں

جس پر خدائے پاک کو صد ناز ہے رفیقؔ
بے شک وہ ذات آپؐ ہیں کردار آپؐ ہیں

مسعود چودھری

نعت

حامد و احمد و محمود رسولِ عربی
میرا مقصد مرا مقصود رسولِ عربی

کتنا خالق کا ہے انسان پہ احسانِ عظیم
آپ کی بعثتِ مسعود رسولِ عربی

شب اسریٰ سبھی اسرار عیاں ہوتے گئے
آپ ہیں شاہد و مشہود رسولِ عربی

ہستی جاں میں اندھیروں کے سوا کچھ بھی نہیں
کھولیے اس پہ درِ جُود رسولِ عربی

جس میں رہتی نہ ہو مہکار درودوں کی رچی
میری وہ سانس ہے بے سود رسولِ عربی

آپ نے کلمۂ توحید کا اذکار کیا
آپ ہیں شاہد معبود رسولِ عربی

کیجئے مجھ کو عطا فہم و ذکا فکرِ رسا
دامنِ نطق ہے محدود رسولِ عربی

جب زیارت سے مشرف مری آنکھیں ہونگی
آئے وہ لمحہ مسعود رسولِ عربی

حنیف ساجد

نعت رسولِ مقبول ﷺ

کبھی دیکھوں وہی رستہ کبھی وہ بھی سفر آئے
کہ سورج سے کہیں روشن جہاں ذرہ نظر آئے

ازل کی ساعتِ اوّل سے تا بہ ساعتِ محشر
نہیں ممکن زمانے میں کوئی تجھ سا بشر آئے

رگِ جاں میں سمائی جب اُنہی کے نام کی خوشبو
جو محرومِ ثمر تھے اُن پہ بھی کھل کر ثمر آئے

ترے قدموں کے ذرے جب اُڑے اطرافِ عالم میں
زمیں کے دامنوں میں ان گنت لعل و گہر آئے

نہیں معلوم مجھ کو یہ مقامِ بے خودی کیسا
جدھر دیکھوں میں دُنیا میں مدینہ ہی نظر آئے

ملی شام و سحر کو تازگی یوں اُن کی آمد پر
کبھی نے پیرہن بدلے کبھی چہرے نکھر آئے

نہیں رکھتا میں ساجد مسندِ دنیا کی کچھ خواہش
مری شاخِ عقیدت پر غلامی کا ثمر آئے

ناصر زیدی

☆

ہمت کوہ شکن ہے مجھ میں
پھر بھی صدیوں کی تھکن ہے مجھ میں

کس نے ٹھنڈک میں بدل دی ہے جلن
کون یہ سایہ فگن ہے مجھ میں

کس کی خوشبو سے مہکتا ہے بدن
کون یہ جانِ چمن ہے مجھ میں

دشت در دشت لیے پھرتی ہے
خواہش سرو سمن ہے، مجھ میں

سب کے غم میں ہوں برابر کا شریک
ساری دنیا کی دکھن ہے مجھ میں

جس ظلمت میں مقید تھا کبھی
اب اُجالوں کی گھٹن ہے مجھ میں

یونہی روشن تو نہیں شامِ وصال
کوئی مہتاب کرن ہے مجھ میں

جس کے رستے ہیں انوکھے ناصرؔ!
ایسی منزل کی لگن ہے مجھ میں

انور سدید

☆

قمقمہ تاریکیوں کے درمیاں روشن ہوا
جب 'خیال آیا' ترا' آفاقِ جاں روشن ہوا

ڈوبنے والے ستاروں کا خیال آیا تو پھر
ذہن میں اپنے خیالِ رفتگاں روشن ہوا

سلسلہ در سلسلہ پھیلی ہوئی تھی تیرگی
چاند جب نکلا زمیں سے آسماں روشن ہوا

تُو وہ سورج ہے کہ جس کی روشنی ہے بے کراں
میں وہ جگنو جس سے جنگل کا جہاں روشن ہوا

بادباں یادوں کے جب کھولے تو اے انور سدید
تہہ بہ تہہ کائی میں لپٹا' آسماں روشن ہوا

حسن عسکری کاظمی

☆

حصارِ جبرِ مسلسل میں ہے، وطن میرا
کہ چاند تارے نہ کوہ و دمن نہ بن میرا

خزاں کے عہد میں سب گیت مر گئے میرے
کہ شاخِ گل ہے نہ اب لالہ و سمن میرا

میں اپنے قریۂ جاں میں اداس ہوں کب سے
کوئی دیار نہ صحرا نہ ہے چمن میرا

میں اس کے ساتھ گھڑی دو گھڑی رہا جب بھی
عجب طرح سے مہکتا رہا بدن میرا

تراش ایسی بھی تیکھی نہیں خدا جانے
بھلا لگا ہے یہ سادہ سا پیرہن میرا

اگرچہ ملگجی کپڑے ہیں جسم پر پھر بھی
سحر مثال ہے شفاف حسنِ ظن میرا

جب اس کی جھیل سی آنکھوں میں ڈوبنا چاہا
سمندروں سے بھی گہرا لگا ہے من میرا

کوئی دریچہ عجب مجھ پر آگہی کا کھلے
کہ دل کا ساتھ بھی دینے لگے دہن میرا

بہت سی تہمتیں مجھ پر لگائیں دنیا نے
ابھی ہوا نہ تھا میلا مگر کفن میرا

ملا نہ رزقِ محبت مجھے زمانے سے
میں سادہ دل ہوں فقط یار ہے حسن میرا

اکبر حمیدی (اسلام آباد)

☆

اگر ہمت جواں رکھیں گزارا ہو بھی سکتا ہے
چمک ہو دل میں تو ذرہ ستارا ہو بھی سکتا ہے

جو طوفاں میں سہارا دے ہمالہ ہے وہ تنکا بھی
وہ تنکا ہی سہی لیکن سہارا ہو بھی سکتا ہے

بس اک میٹھی نظر درکار ہے اپنا بنانے کو
نہیں ہے جو ہمارا وہ ہمارا ہو بھی سکتا ہے

ہوس انگارہ ہے جو عمر بھر دل میں سلگتا ہے
ہوا دیں گے تو انگارا شرارا ہو بھی سکتا ہے

اگرچہ زہر ہے ہر غم، گوارا کرنا مشکل ہے
مگر کچھ صبر کر لیں تو گوارا ہو بھی سکتا ہے

بہت مشکل سہی حالات لیکن سر چھپانے کو
ارادہ ہو اگر، کچھ اینٹ گارا ہو بھی سکتا ہے

وہ خود ہی بکنے کو آیا ہے بازارِ محبت میں
اگر تم چاہو تو اکبر تمہارا ہو بھی سکتا ہے

احمد صغیر صدیقی

☆

بگڑ گیا ہے مقدر جنوں بہل گیا ہے
یہ کیا طلوع ہوا ہے یہ کون ڈھل گیا ہے

میں اتنا ٹوٹ چکا ہوں کہیں رہا ہی نہیں
سمجھ رہی ہے یہ دنیا کہ جی سنبھل گیا ہے

تو پھر یہ کیا ہے کہ سنکا ہوا ہے جس سے یہ دل
کہا یہ کس نے کہ سودائے سر نکل گیا ہے

اکیلا ہوتے ہی وہ یاد یار آ گئی ہے
اندھیرا ہوتے ہی کوئی چراغ جل گیا ہے

لہو کا رنگ ہے اب تک وہی، ازل سے جو تھا
اُسے کہو کہ زمانہ بہت بدل گیا ہے

میں بوند بوند ان آنکھوں سے اب ٹپک رہا ہوں
درونِ جاں کوئی پتھر تھا جو پگھل گیا ہے

عذاب سے نہیں کم دوسرے عذاب کا خوف
میں اک عذاب میں ہوں، اک عذاب ٹل گیا ہے

شوکت واسطی

☆

تم کو نہیں شعورِ وفا کا شعار کچھ
قائل، نہ کر سکو گے بتاؤ ہزار کچھ

بیشک گلابِ تازۂ خوشبو نواز ہو
پر ذات میں تمہاری ہیں پیوست خار کچھ

اے بے نیازِ شوقِ محبت ذرا سنو!
دل کہہ رہا ہے بات یہ بے اختیار کچھ

ہے یہ وطن مدام خزاں کی فرود گاہ
ہر باغباں سنائے نویدِ بہار کچھ

گذری ہے زندگی مری خبطِ خلوص میں
اغیار خوش ہے، تو خفا اور یار کچھ

دو پھول دوست نے تحفہ دیئے مگر
کانٹے پروئے جن کا نہیں ہے شمار کچھ

اب حلقۂ ادب میں گوارا ہیں چند لوگ
پھر نسبتاً مذاق پہ ہیں ناگوار کچھ

پیدا پھر اک حسیں سے تعلق ہے چاہ کا
گمراہ کر چلے ہیں لب و چشمِ یار کچھ

شوکت غزل میں ہے جو یہ احیائے جاں فزا
گویا ہوئے نئے ذہنِ طرح دار کچھ!

سہیل غازی پوری

☆

خیالِ غنچہ دہن خواب کی طرح ٹوٹا
کہ جب ضمیرِ چمن خواب کی طرح ٹوٹا

پڑا جو عکسِ تحیّر مثالِ برقِ تپاں
تو آئنہ سا بدن خواب کی طرح ٹوٹا

کچھ اس ادا سے دلوں میں کدورتیں جاگیں
کہ الفتوں کا چلن خواب کی طرح ٹوٹا

مری زباں سے مدلّل جواب سنتے ہی
کسی کا رنگِ سخن خواب کی طرح ٹوٹا

یہی ہوا کہ یقیں جب مجھے نہیں آیا
تو ظرفِ وعدہ شکن خواب کی طرح ٹوٹا

جو مل سکی نہ مئے خوں تو چند لمحوں میں
خمارِ خلیۂ تن خواب کی طرح ٹوٹا

لبوں پہ اُس کے تبسم کی ضو اُبھرتے ہی
حصارِ رنج و محن خواب کی طرح ٹوٹا

غزل نے جیسے ہی پہنا لبادۂ جدّت
نظامِ قریۂ فن خواب کی طرح ٹوٹا

خدا کا شکر ہے کہ کشکول پھینکتے ہی سہیلؔ
گلے کا طوقِ کہن خواب کی طرح ٹوٹا

صدیق شاہد

☆

کچھ ایسا شیفتہ دل سرو قامتوں کا تھا
ذرا ملال نہ اپنی جراحتوں کا تھا

جب آئے سامنے دیکھا نہ آنکھ بھر کر بھی
غرور ہم کو بہت ان سے نسبتوں کا تھا

میں شب سے دست و گریباں ہوا تو دن آیا
یہ امتحاں مری ہمت کی وسعتوں کا تھا

گرہ کچھ اور پڑی دل میں اس ستم گر کے
اثر یہ الٹا ہماری وضاحتوں کا تھا!

فریب جادہ و منزل سے ہم الجھتے رہے
گلہ سمجھ کا نہ رونا بصیرتوں کا تھا!

گئے تو کوئے ملامت کے ہو رہے سب لوگ
کسے خیال زمانے کی تہمتوں کا تھا!

انا کے گنبدِ بے در میں چھپ گیا آخر
وہ جس کو دعویٰ پرانی رفاقتوں کا تھا

رہی ہے کاوشِ اظہار نامکمل سی
طویل سلسلہ شاہدؔ عبارتوں کا تھا

ایوب ندیم

☆

دور اُفق میں ایک ستارا باقی ہے
میرے دل میں نام تمہارا باقی ہے

ساحل اور سمندر ایک ہوئے لیکن
شاید کوئی خشک کنارہ باقی ہے

یوں تو سارے رشتے ٹوٹ گئے اپنے
پھر بھی اب تک پیار تمہارا باقی ہے

اپنی گھر میں چاند نہیں اترا تو کیا
روشنیوں سے عہد ہمارا باقی ہے

جل تھل سارا جسم ہوا ہے اندر سے
پھر بھی دل میں اک انگارہ باقی ہے

اُجڑے گلشن میں اک پھول مہکتا ہے
اس دنیا میں پیار سہارا باقی ہے

زُلف گھٹا سے کس نے جھانکا ہے ایوبؔ
راکھ میں کس کا حسن شرارہ باقی ہے

☐

محمد اقبال اختر (ڈنمارک)

☆

روح کا جوہر قریۂ جاں میں جیسے دریچہ
دل کے حرم پھیلی خوشبو حُسن کا عقدا

گھر کے مست گھٹا آئی لیکن نہیں برسی
جل تھل جل تھل پھوٹ بہا آنکھوں سے دریا

اس کو یکجا کر کے دیکھوں کب ممکن ہے
چاروں طرف ہر اک منظر ہے بکھرا بکھرا

آدمی آج اخوت، شفقت پیار سے خالی
دنیا میں ہے ایک تغیر عجب سا برپا

فرش بچھایا اس نے کیا کیا پھول کھلائے
قدر سب پر جس کو جس بھی حال میں رکھا

شوق کی موج تھی ذہن اور طلب لے آئی
مہنگا تھا مفلس کے لئے بازار میں سودا

بسم اللہ سے کاش شروع کرتے ہم اخترؔ
جب انجام ہوا منزل کا تو یہ سوچا

☐

انوار فیروز

☆

آگہی کی روشنی جب دُور تک پائی گئی!
کٹ گیا اس کا گلا ظلمت میں دفنائی گئی

پیار کا پودا جواں ہو کر اچانک جل گیا
اس کے اوپر نفرتوں کی آگ برسائی گئی

رات کو تم دن کہو آنسو پیو ہنستے رہو
مختصر سی بات تھی برسوں میں سمجھائی گئی

پرسکوں سرسبز دھرتی زلزلوں کی زد پہ تھی
جو عمارت بھی نظر آئی وہی ڈھائی گئی

لفظ آزادی نیا مفہوم لے کر آ گیا
صبح کی کرنوں کو بھی زنجیر پہنائی گئی

منجمد ماحول کی نبضیں اچانک چل پڑیں
آنکھ سورج کی کھلی، برسوں کی تنہائی گئی

جب بھی انوار ہم نے فصلِ گل مانگی یہاں
کاغذی پھولوں کی صورت ہم کو دکھلائی گئی

سیّد ضیاء الدین نعیم

☆

پرائے پن کا ہے اب تک پڑاؤ لہجے میں
کہیں سے ڈھونڈ کے لاؤ، لگاؤ لہجے میں

یہ بات اپنی طرف سے نہیں کہی تم نے
عیاں ہے صاف کسی کا دباؤ لہجے میں

عدم توجہی گویا مری، کھلی اس کو
تبھی دَر آیا ہے اتنا تناؤ لہجے میں

یہ گفتگو کسی ذی روح کی نہیں لگتی
کوئی اُتار نہ کوئی چڑھاؤ لہجے میں

زبان پر تو بظاہر خوشی کے کلمے ہیں
دہک رہا ہے حسد کا الاؤ لہجے میں

نعیم دن وہ سہانے خیال و خواب ہوئے
مٹھاس لفظوں میں تھی، رکھ رکھاؤ لہجے میں

قاضی اعجاز محور

☆

کوئی شکوہ تھا تو وہ دور بھی کر سکتا تھا
وہ کسی روز ادھر سے بھی گذر سکتا تھا

بھول جانے کا کیا خیر بہانہ اس نے
وہ اگر چاہتا وعدے سے مکر سکتا تھا

آج وہ چھوڑ گیا دیکھ کے مشکل میں مجھے
کل وہی شخص مرے نام پہ مر سکتا تھا

روشنی بانٹنے نکلا تھا وہ سورج لے کر
میرا گھر قریۂ مہتاب وہ کر سکتا تھا

وہ برستا نہ مری سوچ کے ویرانوں پر
کھیتیاں دل کی تو سیراب وہ کر سکتا تھا

میرے بس میں تو یہی تھا اُسے رسوا نہ کروں
وہ اگر چاہتا کچھ کرنا تو کر سکتا تھا

خودکشی اس کی مجھے کر گئی رسوا محور
وہ یہی کام خموشی سے بھی کر سکتا تھا

ڈاکٹر احمد فاروق مشہدی

☆

یہ کیسے نت نئے اپنے ٹھکانے ڈھونڈتے ہو
یہ مجھ سے دور رہنے کے بہانے ڈھونڈتے ہو

یہاں تو کوئی منظر بھی نہیں ہے ایک جیسا
بہت ناداں ہو اپنے سے زمانے ڈھونڈتے ہو

غرض ہے ہر کسی کو اپنی چاہت سے وفا سے
وہ کیا الفت ہے تم جس کے فسانے ڈھونڈتے ہو

یہاں تو ہے وفا میں اپنی جاں کو بھی گنوانا
بہت آسان سے تم تو نشانے ڈھونڈتے ہو

نیا رستہ کوئی اپنے لیے اب ڈھونڈ لو تم
عجب ہو تم تعلق بھی پرانے ڈھونڈتے ہو

اُداسی کا سماں چھایا ہے جب اپنے ہی اندر
یہ باہر کس لیے موسم سہانے ڈھونڈتے ہو

رومانہ رومی

☆

دکھ درد اپنے طور پر کم کر رہی ہوں میں
ماضی کو اپنے حال میں ضم کر رہی ہوں میں

اک پل کو بھی ہری نہ ہوئی جو کسی طرح
اُس شاخِ آرزو کو قلم کر رہی ہوں میں

گھیرے میں آ چکی ہوں میں آسیبِ وقت کے
پڑھ کر تمہارے نام کو دم کر رہی ہوں میں

صحرا کی ریگ زار میں شبنم تلک نہیں
دامن کو اس کی یاد سے نم کر رہی ہوں میں

قرطاسِ صبح و شام پہ رومی غزل کے ساتھ
اپنی حدیثِ دل بھی رقم کر رہی ہوں میں

مسعود چودھری

☆

ابھی یہ درد کی کونپل شجر ہونے نہیں پائی
ابھی یہ لہر آنسو کی بھنور ہونے نہیں پائی

خود اپنی تعزیت کرتا ہوں پُرسہ خود کو دیتا ہوں
کسی کو میرے مرنے کی خبر ہونے نہیں پائی

چھٹی آئی دہائی اور بھی تاریکیاں لے کر
یہ کیسی رات ہے جس کی سحر ہونے نہیں پائی

گلہ کوئی ستاروں سے نہ جگنو سے نہ تتلی سے
اُداسی بھی میری جب ہمسفر ہونے نہیں پائی

جنازہ جب سے اک بوڑھے مکیں کا گھر سے نکلا ہے
منقش یہ عمارت پھر سے گھر ہونے نہیں پائی

نقب اندر ہی اندر سے لگائی جا رہی تھی پر
بڑی ہی گہری سازش تھی مگر ہونے نہیں پائی

مجھے ہر حال میں ہی جیتنا تھی جنگ جیت آیا
میری ماں کی دُعا بھی بے اثر ہونے نہیں پائی

ابھی مسعودؔ زخمِ دل کی چنبلی کو کھلنے دو
ابھی بزمِ نگاراں کو خبر ہونے نہیں پائی

عرفانہ امرؔ

☆

چاند تجھ سے میری باتیں کوئی کرتا ہو گا
نام لے لے کے میرا تجھ سے بہلتا ہو گا
دیکھتا ہو گا فلک پر جو ستاروں کا ملن
دل ہی دل میں مرے قدموں سے لپٹتا ہو گا
اوڑھنا یاد مری، خواب، بچھونا ہوں گے
کسی کروٹ بھی کہاں چین سے سوتا ہو گا
بھول بھی جا اُسے احباب یہ کہتے ہوں گے
اپنے کمرے میں وہ تنہا ہی سلگتا ہو گا
ساتھ گزرے ہوئے لمحات ستاتے ہوں گے
سانس بھی جیسے کوئی تیر سا چلتا ہو گا
آتشِ ہجر جو تن من کو جلاتی ہو گی
اک دھواں سا در و دیوار سے اٹھتا ہو گا
لالہ و گل بھی کھلے ہوں گے رُخِ یار لیے
صحنِ گلشن سے بھی مر مر کے گزرتا ہوگا
دل میں ماضی کی کسک آنکھ میں فردا کی نمی
پرسشِ حال پہ کس طرح سنبھلتا ہو گا
کون جانے ہے مجھے اتنے حوالوں سے امرؔ
ہر مرا شعرِ غزل دل میں پرکھتا ہوگا

عمران عامیؔ

☆

جو روشنی میں دیا سا دکھائی دیتا ہے
کسی کا ہے وہ کسی کا دکھائی دیتا ہے

پلٹ کے دیکھ رہا ہے مجھے بھی وہ لیکن
مرا نہیں ہے جو میرا دکھائی دیتا ہے

مرے یقین میں شامل تری محبت ہے
مجھے یہ راستہ سیدھا دکھائی دیتا ہے

گزر رہا ہوں میں جس سے یہ پُل صراط نہیں
مگر یہ ویسے کا ویسا دکھائی دیتا ہے

مجھے کسی پہ بھروسہ نہیں رہا جاناں
مجھے یہ چاند بھی تیرا دکھائی دیتا ہے

مجھے یقیں ہے وہ آئے گا سر بکف عامیؔ
صدا تو آئی ہے پردہ دکھائی دیتا ہے

سلمیٰ ریاض

☆

پیار سے یوں مت دیکھو مجھ کو
آنسو ہوں چھلکا دو مجھ کو
کھو دینا آسان ہے لیکن
ڈھونڈ سکو تو ڈھونڈو مجھ کو
ٹوٹ رہی ہے سانس کی ڈوری
رشتوں میں مت باندھو مجھ کو
میں تقدیر سے تم کو مانگوں
تم دنیا سے چھینو مجھ کو
دیکھو جان نہ لے لے فرقت
کوئی اور سزا دو مجھ کو
دنیا سے بیگانہ ہو کر
میرے ساتھی چاہو مجھ کو
سُنتی ہوں مصروف بہت ہو
فرصت ہو تو سوچو مجھ کو

اختر خیال

☆

مجھے پیار کی کوئی حسرت نہیں ہے
کروں پیار تجھ سے یہ فرصت نہیں ہے

دکھوں کا فسانہ سناؤں کسے میں
زمانے میں دیکھی شرافت نہیں ہے

تجھے دیکھ کر دل نہ مچلے ہے میرا
میرے جسم و جاں میں حرارت نہیں ہے

میری خوش نصیبی میرے گھر وہ آئے
سناؤں فسانہ یہ جرأت نہیں ہے

لکھو نہ قصیدہ تم ہر حال اختر
ابھی تجھکو اس کی ضرورت نہیں ہے

فرزانہ خان نیناںؔ (نوٹنگھم)

☆

تخلیق کا عمل اسے سچی خوشی لگا
عورت کو کربِ ذات نئی زندگی لگا

لگتا ہے مجھ کو میں کسی مردہ بدن میں تھی
جینے کا حوصلہ جو ملا اجنبی لگا

آتی ہوئی رتوں کی اچانک خبر ملی
جب رنگ ڈھالنے کوئی تازہ کلی لگا

سپنے میں کیا لکھا ہے یہ تو نے نگارِ شب
وہ چاند کی مثال مجھے چاند ہی لگا

اک جھیل میں کنول پہ وہ محوِ خرام خواب
آنکھوں کے پانیوں کی مجھے شاعری لگا

خوشبو سے جس کی رہتی ہوں سرشار و دم بخود
پیکر مرا اسی کو بہت کامنی لگا

نیناںؔ اڑی جو نیند، تو اک جاں فزا خیال
خوشبو لگا ...... بہار لگا ...... روشنی لگا

رخشندہ نوید

☆

کچے گھروندے ریت پہ بکھرا کے لگ گئی
وہ تو ہوا تھی رستے پہ لہرا کے لگ گئی

اُس لہر نے سپردِ سمندر کیا مجھے
سوچا تھا میں کنارے جسے پا کے لگ گئی

اس کی عطا تھے زخم کہاں کھولتی انہیں
اس کے گلے ہی روتے ہوئے جا کے لگ گئی

میں کب ادھر گئی کہ جدھر تھی ہوائے عشق
بیماری کیسے جانے مجھے آ کے لگ گئی

سونا تو ایک غیر ارادی سا امر تھا
اتنی تھکن تھی تکیے سے گھبرا کے لگ گئی

ان کاوشوں میں طے ہو کسی طور کوہِ زیست
تھوڑا سا پی کے تھوڑا سا کچھ کھا کے لگ گئی

ممکن ہے اب کہ اور مکمل ہو میرا دل
تعمیر میں یہ دنیا اسے ڈھا کے لگ گئی

مشتاق شبنم

اسے دیکھا نہیں جانا بہت ہے
بقدرِ علم اندازہ بہت ہے

یہی ہے نکتۂ روحِ عبادت
خلوصِ دل سے اک سجدہ بہت ہے

شگفتہ کیوں نہ ہوتا جا بجا سے
لباسِ زیست کو پہنا بہت ہے

تعفن کا سبب بنتا ہے آخر
جو پانی منجمد رہتا بہت ہے

پرستش مجھ کو لے آئی کہاں تک
جہاں سجدے ہیں کم کعبہ بہت ہے

اندھیرا بڑھ رہا ہے ذہن و دل کا
فروغِ صبح کا چرچا بہت ہے

گھرا رہتا ہے اپنے دشمنوں میں
مگر شبنم یہ لاپروا بہت ہے

طالب انصاری

☆

ہر پھول اٹھائے گا خسارا مرے پیچھے
پت جھڑ کا یہاں ہوگا اجارا مرے پیچھے

میں اس کی رسائی سے نکلتا گیا آگے
آتا رہا قسمت کا ستارا مرے پیچھے

دیکھوں گا اُسی کو جو مرے سامنے آئے
ہوتا رہے رنگین نظارا مرے پیچھے

مڑ کر نہیں دیکھوں گا بھلے ڈوب ہی جاؤں
دریا مرے آگے ہے کنارا مرے پیچھے

ہوتا جو مقابل تو میں ٹھوکر سے اُڑاتا
حالات نے ہر بوجھ اتارا مرے پیچھے

یہ فکر کہیں بھی مجھے جانے نہیں دیتی
رہ جائے گا تنہا مرا پیارا مرے پیچھے

یونہی تو نہیں پھرتا میں حیران و پریشاں
اک خواب ہے تعبیر کا مارا مرے پیچھے

اس زعم نے رکھا نہ کہیں کا مجھے طالب
ہوگا نہ کسی کا بھی گزارا مرے پیچھے

حسن عباسی

☆

ڈھلتا سورج، ٹیلے اور کھجوریں چولستانی
میرے اندر ٹھہر گئی ہیں شامیں چولستانی

شہر لہور میں جی نہیں لگتا جی نہیں لگتا میرا
دیکھی ہوئی ہیں جن آنکھوں نے صبحیں چولستانی

ستلج کے پہلو میں گذرے دن وہ کیسے بھولوں
کیسے بھولوں کیسے بھولوں راتیں چولستانی

کوئی منظر ان آنکھوں کو خیرہ کر نہیں سکتا
جن آنکھوں نے دیکھی ہوئی ہیں صبحیں چولستانی

پاکستان میں سب سے اچھا شہر بہاولپور ہے
ساری دُنیا سے اچھی ہیں رسمیں چولستانی

واجد امیر

☆

حصارِ وقت میں ایسا بھی رائیگاں نہیں تھا
مگر جہاں مجھے ہونا تھا میں وہاں نہیں تھا

بُرا ہوا کے اسے صحن تک اُٹھا لائے
یہ دشت پہلے پہل اتنا بے کراں نہیں تھا

ہمیشہ لفظ لہو سے کشید کر کے لکھا
یہ کوئی بھی تو محبت کا ترجماں نہیں تھا

زمیں اپنی ہی گردش کے گرد لپٹی رہی
سو اہل دل پہ کوئی وقت مہرباں نہیں تھا

مگر وہ رنگ جو اندر کہیں مہکتے ہیں
وگرنہ کچھ بھی کھلی آنکھ سے نہاں نہیں تھا

تم ایسے وقت مرے دل کے پاس آتے تھے
یہاں پہ ہوتے ہوئے بھی میں جب یہاں نہیں تھا

سفید شاخ پہ رکھا تھا سبز پتوں کو
شجر تو تھا یہاں موجود آشیاں نہیں تھا

قدیم شہر کے باسی ملیں تو کہتے ہیں
یہاں دُکان نہیں تھی یہاں مکاں نہیں تھا

محمد اقبال اختر

جمیل یوسف......صف اوّل کے شعراء میں ممتاز شخصیت

آج بھی عہد ماضی کی طرف جھانک کر دیکھتا ہوں تو جمیل یوسف کے والدین شیخ محمد یوسف اور بی بی جی کی شفقت اور محبت کی حسین وجمیل یادیں دل و دماغ میں شیش محل سجائے محسوس ہوتی ہیں۔ میرے خوابوں کے جھروکوں میں صوم وصلوٰۃ کے پابند بزرگوں کی نورانی صورتیں اب تک منقش ہیں۔ خالق کائنات کی شاہکار تخلیق وہ پرتاثیر چہرے حسین زندگی کی تفسیر مقدس ہیں۔ آپ دونوں چکوال میں ہی محکمہ تعلیم سے منسلک رہے تھے۔ غالباً اسی لیے بچوں کی دینی اور دنیاوی تعلیم وتربیت پر خصوصی توجہ دیتے تھے۔

جمیل یوسف کی آنکھوں میں ذہانت کی طلسماتی چمک، میانہ قدوقامت، چھریرا بدن، صاف گندمی رنگت، گھنی مونچھیں، طبیعت میں سیمابیت لیکن ظاہری کیفیت پرسکون، مدنہ جزر نہ نشیب نہ فراز۔ سمندر سینے کی تہہ میں طوفان بپا۔ عمر میں میرے برابر ہوں گے۔ لیکن علم وفضل میں پیر و مرشد۔ کالج کی بزم ادب کے جنرل سیکرٹری ہوا کرتے تھے۔ کالج کے میگزین میں ان کے مضامین اور کلام شائع ہوتے تھے۔ بی اے میں امتیازی پوزیشن حاصل کی اور گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لے لیا۔ ایم اے کے بعد تین سال پروفیسر رہے۔ اسی ایس ایس کے امتحان میں نمایاں کامیابی حاصل کی اور بحیثیت ملٹری اسٹیٹ آفیسر خدمات سرانجام دیں۔ وہ ادبی ایوان کے ادب نواز شخصیت تھے اور ملازمت مختلف المزاج، آفس میں دفتری نوعیت کے کام، بحیثیت مجسٹریٹ عدالتی سرگرمیوں سے بھرپور ذمہ داریاں، آزادی سے لکھنے پڑھنے کے لیے سروس سے دس سال پہلے ہی ریٹائرمنٹ لے لی۔ طبعاً بہت ہی مخلص، بامروّت، شریف النفس، ملنسار اور ہمدرد انسان ہیں۔ گزشتہ نصف صدی سے شعر و ادب کے دشت کی سیاہی میں رواں دواں ہیں۔ اگرچہ ایک طویل عرصہ اعلیٰ سروس پر معمور رہے۔ لیکن ٹھاٹھ باٹھ، کروفر اور

خود نمائی سے کوئی دلچسپی نہیں۔ بہت سادہ مزاج اور درویش صفت ہیں۔ ہمیشہ محبتیں بانٹتے رہے۔ شخصیت میں سمندر کا سا پھیلاؤ ہے۔ اپنے کام میں مگن اپنے مقصد اور مشن سے سروکار۔ صاحب حال فقیر کی طرح اپنی دھن میں مست' قدرت نے قلم عطا کیا جو وقت کی دست برد سے بے نیاز ہے۔ بظاہر محترم اور معزز اور فی الحقیقت رنگ رنگیلا اور وسیع المشرب' بلا کے ذہین اور حاضر دماغ' کلام تحت اللفظ پڑھتے ہیں اور خوب پڑھتے ہیں۔ تحریر اور تقریر میں حسن ہی حسن جاذبیت ہی جاذبیت' ملک کے اندر اور باہر عزت اور شہرت کمائی۔ اپنے اور بیگانے سب سے اپنائیت اور نیک نامی سمیٹی۔ ذاتی جوہر اور قابلیت کی وجہ سے انفرادیت حاصل کی۔ زاویہ نظر مثبت اور تخلیقی صلاحیت سے پر شباب' نقوش' فنون' اوراق' لیل ونہار' ادب لطیف' سویرا' نیرنگ خیال سیپ' معاصر' اردو ڈائجسٹ' ارتکاز منزل' ساحل اور ادب دوست الغرض ہر معیاری رسالے میں ان کی نگارشات مزین ملتی ہیں۔ موج صدا' گریزاں' غزل' سر ساخ بیاں' بابر سے ظفر تک' مسلمانوں کی تاریخ (ایک جائزہ) سرسید احمد خان (شخصیت اور فن) جل پری کے دیس میں (سفر نامہ)۔ ان تصانیف نے اہل علم و دانش سے بے حد پزیرائی حاصل کی اس وقت میرے پیش نظر ان کا شعری مجموعہ "سر ساخ بیاں" ہے۔

شدت احساس، تفکر کی گہرائی مشاہدے کی ہمہ گیری اور ماحول کی اثر آفرینی شاعری کو جنم دیتی ہے۔ خالص فنی سطح پر فنکار کے تجربے کا عمق' صوتی آہنگ مشاہدے کا بے ساختہ پن' اس کے احساس کی صداقت' غزل کی سحر کاری و جادو آفرینی' موضوعات کا کہکشاں در کہکشاں پھیلتا اظہار کائنات کے حسن کو مزید نکھارتا چلا جاتا ہے۔ اس کی شاعری میں یاسیت کی بجائے جہاں ہمتی' حسن فطری کی عکاسی' جذبہ تسخیر کائنات' گزرتے وقت کی بے ثباتی کا المیہ' ادب کو عظمت انسانی کے حصول کا ذریعہ' تغزل کے فن میں جدت وتنوع۔ الغرض اردو غزل کے اکابرین کی سنہری روایات کو ذہن میں رکھتے ہوئے پورے حسن اور ابلاغ کے ساتھ شعر کہنا معیار سخن کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

اک تماشہ ہے آدمی کیا ہے
اک تمنا ہے زندگی کیا ہے
حسن اک دائمی حقیقت ہے
ورنہ یہ کائنات ہی کیا ہے

ہوا چلی تو نشہ چھا گیا فضاؤں میں
خیال ڈوب گیا دور کی صداؤں میں
نہ عشق کی کوئی منزل نہ حسن کا کوئی طور
یہ آگ کیسے گرفتار ہو وفاؤں میں
مرے قریں ہو تو وہ گل بکھر بکھر جائے
مرا وجود بھی شامل ہے ان اداؤں میں

جسے تمہاری محبت کا حوصلہ ہو گا
زمانہ اس کے تصور کو پوجتا ہو گا
ترے حضور جسے ایک پل قرار نہیں
ترے فراق میں اس دل کا حال کیا ہو گا
کہاں وہ لے ہے جو تیرے بدن سے اٹھے گی
کہاں وہ شعر ہے جو ترا آئینہ ہو گا

دم قدم سے میرے قائم بزم ہستی کا وجود
میرے ہست وبود سے یہ چیستان ہست بود
دیدہ و دل کا کرشمہ ہے یہ ساری کائنات
وادئ فرشِ زمیں، یہ خیمۂ چرخ کبود
گردشِ حالات کا شاکی بنا پھرتا ہوں میں
میں کہ ہوں تکمیل عالم، میں کہ ہوں جانِ وجود

جمیل یوسف محبت کے نرم وملائم جذبات کا شاعر ہے۔ انسانی جذبات ومحسوسات اور زندگی کے حسن و جمال کو سمجھ کر ان کی تہہ تک پہنچ کر تخلیقی کاوش کا حصہ بنانا ہی قاری کو روحانی مسرت وتسکین عطا کرتا ہے۔ جدید تہذیب کے گردونواح میں پھیلے ہوئے واقعات جب شاعر کے محسوسات اور اس کی شخصیت کی طبعی افتاد سے ابھر کر جذبے کی صداقت بنتے ہیں تو وہ فضا وہ لہریں شعر میں جادو کا سا اثر اجاگر کرتی ہیں۔ یہی وہ فنی خوبی ہے جسے ٹی ایس ایلیٹ نے معروضی تلازمات کا نام دیا ہے۔ یہی وہ خداداد صلاحیت ہے جو اس عہد کے کسی دوسرے شاعر کو اس قدر وافر کم ہی نصیب ہوئی ہے۔

ہے یادوں میں جوانی ترے بدن کی سی
مگر وہ بات کہاں تیرے بانکپن کی سی
مہک رہا ہے نظر میں ترے لبوں کا گلاب
بسی ہے دل میں تری یاد انجمن کی سی
کہاں ہے زہرہ میں وہ شعلہ اس جبیں کا سا
کہاں ہے غنچے میں وہ بات اس دہن کی سی

اے خدایا فن ہے کس کی بت تراشی کا کمال
خاک سے نکلی ہیں آخر ایسی کیونکر صورتیں
ہے نظر کے سامنے اک بے اماں سیل رواں
چاندنی، دریا، ستارے، پھول، پتھر صورتیں
صورتوں میں ڈھل گیا ہے فکروفن کا اک جہاں
کیا مصور صورتیں ہیں کیا سخنور صورتیں

جو لازوال ہو ایسی خوشی نہیں ملتی
دل و نگاہ کو آسودگی نہیں ملتی
نہ جانے کتنے ہی پیکر تراش ڈالے ہیں
خیال و خواب کی نازک پری نہیں ملتی
قدم قدم پہ کئی پھول مسکراتے ہیں
بس ایک شاخ تمنا ہری نہیں ملتی

شاعر کے باطن میں بے پناہ تخلیقی وفور ہے۔ خدا کے حسن لازوال' عصری حوالوں اور زمانوں کے تاریخی پیکر، اشعار کے آب شفاف پر زمین و آسماں کے بکھرتے عکس، حسین چہروں کی رعنائی اور مناظر کی بنتی بگڑتی صورتیں انسان کو عدم تحفظ سے دوچار کرتی ہیں۔ اپنی تعمیر کردہ پناہ گاہوں کو رو بہ زوال و فنا دیکھ کر عقلی اور وجدانی سطح پر شاعر بقا اور دوام کے خواب دیکھتا رہ جاتا ہے۔

اگرچہ وہ فطرت کے تصادم اور شکست و ریخت کے عمل سے باخبر ہے۔

خود اپنی ذات کا نام و نشان بھول گئے — مکیں عجیب تھے اپنا مکان بھول گئے
اس اجنبی کی رفاقت میں ایسی خوشبو تھی — ہم اپنے سارے سفر کی تھکان بھول گئے
نہ کر نمود کی خواہش کہ یہ جہاں والے — بڑے بڑوں کا بھی نام و نشان بھول گئے

☆

ساقی کی چشم مست و فسوں گر میں کچھ نہ تھا — اپنے لہو کا رنگ تھا ساغر میں کچھ نہ تھا
گھر کے خیال میں یہاں سب کچھ بھلا دیا — آخر کھلا کہ اپنے لئے گھر میں کچھ نہ تھا
جو تھا وہ موجِ رنگ کے دھوکے میں آ گیا — حسنِ نظر کا عکس تھا منظر میں کچھ نہ تھا

☆

ہے درپئے آزارِ جاں سارا جہاں اور ایک میں — یہ دوریاں یہ سختیاں یہ تلخیاں اور ایک میں
اے خالقِ ارض و سما ہے کیا یہاں اس کے سوا — ہے ایک تیرے حسن کا سرِ نہاں اور ایک میں
اس سیل تند و تیز میں کیا جانے پھر کب ہو بہم — یہ شام یہ ٹھہری ہوئی عمرِ رواں اور ایک میں

میں جمیل یوسف کو کالج میں طالب علمی کے زمانے سے جانتا ہوں۔ اسے اساتذہ کے ہزاروں اشعار زبانی یاد ہیں۔ اس کے ہاں مشقِ سخن' فنی ریاض اور اعجاز ہے۔ وہ استعارے، علامت اور الفاظ کے انمول موتیوں کو بڑی ذہانت سے استعمال کرتا ہے۔ اس کے فن میں تدریجی ارتقاء پنہاں ہے۔ اس نے شعر و ادب میں استعارات کو نئے امکانات نئی وسعتوں اور رسائیوں سے روشناس کیا ہے۔ حصارِ ذات سے نکل کر حسن آفرینی سے ایسی جوت جگائی جو روح کو سرور اور دل و نگاہ کو نور عطا کرتی ہے اور انسان بے ساختہ عش عش کر اٹھتا ہے۔

کچھ ستارے سرِ مژگاں چمکے — اسی صورت شب ہجراں چمکے
تری آواز سے خوشبو پھیلی — تری آہٹ سے گلستاں چمکے

☆

زندگی میں پائیں گے ہم کہاں نشاں اپنا
وہ بھی غیر فانی ہے یہ بھی غیر فانی ہے

اے خدا کہیں مل جائے کوئی ہم زباں اپنا
حسنِ بیکراں تیرا، شوقِ جاوداں اپنا

☆

اس کی سب شوخیِ رفتار تھی میری خاطر
مجھ کو بھی اس سے بچھڑ کر کہیں آرام نہ تھا

راہ میں پھر نہ کوئی پھول کھلا میرے بعد
عمر بھر وہ بھی پریشان رہا میرے بعد

☆

زخم پھر سے نہ ہرے ہو جائیں
جب ستاروں کے کنول کھلتے ہیں

مجھ سے یوں پیار کی باتیں نہ کرو
جھلملاتا ہے تمہارا پرتو

☆

جنوں کی بات نہ کر، آرزو کا ذکر نہ چھیڑ
گزرتے وقت کی چالیں ہیں ان کا بھید سمجھ

جہانِ جبر میں حسنِ نمو کا ذکر نہ چھیڑ
محبتوں پہ نہ جا، رنگ وبو کا ذکر نہ چھیڑ

آج کل شاعری میں جدید وقدیم کی عجیب بحث جاری ہے۔ زمانہ ترقی کر رہا ہے۔ حالات و واقعات تبدیل ہو رہے ہیں۔ دنیا گلوبل ولیج میں تبدیل ہو رہی ہے۔ وقت کے ساتھ مزاج اور زبان و بیان میں تبدیلی از خود رونما ہوتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ کوئی اچھا شعر پرانا یا نیا نہیں ہوتا۔ اچھوتا خیال، خوبصورت شعر ہمیشہ تازہ اور نیا محسوس ہوتا ہے۔ میں نے غالب کو سینکڑوں مرتبہ پڑھا ہے۔ جب بھی پڑھتا ہوں تازگی اور نیا پن محسوس ہوتا ہے۔ جمیل یوسف جدت پسند شاعرانہ مزاج رکھتا ہے۔ اس نے عہد حاضر کے احساسات و جذبات کو رنگ، روشنی اور خوشبو کے حسین امتزاج سے تازہ کاری کی نئی فضائی معنویت اور فن کے جدید، انوکھے اظہار و اسلوب سے تخلیق کیا ہے۔

تری نظر نے کئے جاوداں گلاب کے پھول
ترے بدن کی خنک گرمیاں بہار کے دن

کھلا دیئے سرِ شاخِ بیاں گلاب کے پھول
ترے لبوں کی حسیں پتیاں گلاب کے پھول

☆

دلِ ناشاد کو وہ اک جھلک سے شاد کر دے گا
جو تم سے ہو سکے تو نام بھی مت لو محبت کا

وہ جب دیکھے گا تازہ بستیاں آباد کر دے گا
یہ ایسا سانحہ ہے زندگی برباد کر دے گا

☆

زندگی رقص میں ہے عرضِ ہنر ہونے تک
میں ہوں سرگرم سفر گردِ سفر ہونے تک

آج وہ حسنِ جواں حلقۂ آغوش میں ہے
رات تھم جائے مری عمر بسر ہونے تک

☆

ان کے بے آواز دکھ سے آشنا کوئی نہیں
ہر طرف آنکھیں کھلی ہیں، دیکھتا کوئی نہیں

کس نے دیواریں اٹھا دی ہیں گھروں کے درمیاں
ایک گھر کا دوسرے سے واسطہ کوئی نہیں

وہ مری آنکھوں مری سوچوں مرے خوابوں میں ہے
کیا ستم ہے اس کا مجھ سے رابطہ کوئی نہیں

جمیل یوسف فطرتاً انتہائی حسین پرست اور رنگین طبع واقع ہوئے ہیں۔ اس کی غزلوں میں حسن تغزل کی تابانی، لفظوں میں معنی آفرینی اور روانی، بیان میں سلیقہ اور فکر کی جولانی، جذبات میں شدت اور جوانی یہ ہے۔ خوش فکر شاعر کی شعلہ بیانی۔ وہ شعروادب کا ایسا نباض ہے، جس نے زندگی کے خوبصورت امیجز کو انتہائی لطافت اور شائستگی سے استعمال کر کے عمدہ شاعری کی بنیاد فراہم کی۔ اس کا کلام ترسیل وابلاغ اور فہم وادراک کی عوامی سطح پر رواں دواں رہتا ہے۔ وہ اس دھرتی کے باسیوں کے روزمرہ کے حالاتو واقعات کو نفاست، سادگی اور سادہ بیانی سے تحریر کرتا ہے۔ جسے خاص و عام پڑھ کر روحانی طور پر کیف و سرور سے سرشار ہوتے ہیں۔

ہر چند کہ دعویٰ ہے مجھے عقل و خرد کا
جذبات کے ہاتھوں مری رسوائی وہی ہے

اک شام سر راہ کوئی چھوڑ گیا تھا
ہر روز وہی شام ہے تنہائی وہی ہے

☆

تری آنکھیں، ترا حسن جواں تحریر کرتے ہیں
زمیں کی پستیوں میں آسماں تحریر کرتے ہیں

ہمارا دور ہم کو بھول جائے ہو نہیں سکتا
ہم اپنے دور کا نام و نشاں تحریر کرتے ہیں

گزرتے وقت کو آبِ رواں کا نام دیتے ہیں
فراغت کو نشاط بیکراں تحریر کرتے ہیں

جمیل یوسف حیرت انگیز حد تک قادر الکلام شاعر ہے اور بلاشبہ دورِ جدید کا منفرد غزل گو۔ اس طرح بلاغت اظہار کی معراج تک پہنچنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ اسی کتاب "سرِ شاخِ بیاں" میں حمد اور نعتیں بھی دامنِ دل کھینچ رہی ہیں۔ خدائے بزرگ و برتر نے اپنے عبد کو احسان التقویم کے شرف سے نوازا ہے۔ وہ ہماری توصیف کا محتاج نہیں۔ کائنات کی ہر ایک شے اس کی عظمت اور حمد بیان کر رہی ہے۔ حمد اللہ جل شانہ کی تعریف و تسبیح ہے۔ وہ قادر مطلق ہے۔ ہم اس کی مناجات

کر کے اپنی عاجزی کا اظہار کرتے ہیں۔ اس کے حضور جبین نیاز خم کر کے اپنی بندگی تسلیم کرتے ہیں۔ یہ اس کی بے پایاں نعمتوں کے شکرانے کی کیفیت ہے۔ حمد قرب الٰہی، اس کی عبادت اس کی بارگاہ میں سر جھکانے اور شکرانہ ادا کرنے کے مترادف ہے۔ خالق کائنات نے مختلف زمانوں میں اپنے بندوں کی رہنمائی کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس نے اپنی ہستی کا ادراک اور حمد وثنا، کا طریقہ پیغمبر آخر الزماں محمد مصطفیٰ ﷺ کے ذریعے اپنی کتاب قرآن پاک میں ارشاد فرمایا۔ کلام اللہ کے مطالعہ سے ہی ہمیں معلوم ہوا کہ اس کی عظیم ذات ہی اس جہان کا نقطۂ آغاز ہے۔ وہ ہمارا خالق و مالک ہے۔ تمام تعریفوں کا حقیقی مالک وہی ہے۔ اس کے حکم کی تعمیل ہی عبادت ہے۔ جمیل یوسف نے رب جلیل کے ارشاد کو کیا خوبصورت پیرائے میں قلم بند کیا۔ ''کن فیکون'' کی کیا عمدہ تشریح کی ہے۔

مانگتے ہیں پھول مجھ سے رخصت خندہ زنی
منتظر ہیں حکم کے میرے یہ انجم کے جنود

میری ہستی اعتبار ہستی کون و مکاں
ہے نمود عالم امکاں فقط میری نمود

قطرے قطرے سے ٹپکتا ہے مرا جاہ و جلال
ذرہ ذرہ پڑھ رہا ہے میری عظمت کا درود

☆

تپتے پتھر کی سلوں پر کوئی چشمہ لکھ دے
اس کڑی دھوپ کے آنگن کوئی سایہ لکھ دے

ان سرابوں سے کوئی موج رواں بھی ابھرے
خشک صحرا کے ورق پر کوئی دریا لکھ دے

آسماں سے مرے ساری بلائیں ٹل جائیں
اسم کوئی مری تقدیر میں ایسا لکھ دے

بعد از خدا بزرگ تو ہی قصہ مختصر۔ خالق کون و مکاں نے اپنے رسول مقبول ﷺ کے لیے ''ورفعنا لك ذكرك'' کہہ کر اپنے محبوب علیہ السلام کی نعت کا ابتدائیہ لکھ دیا۔ سبحان تعالیٰ نے قرآن پاک میں اپنے پیارے نبی ﷺ کی تعریف و توصیف بیان کی اور فرشتوں اور انسانوں کو حضور ﷺ کی ذات پر درود و سلام بھیجنے کا حکم دیا۔ نعت دراصل حضور ﷺ کی سیرت مطہرہ، اسوۂ حسنہ رحمت اللعالمین آقائے نامدار تاجدار مدینہ ﷺ کی تعریف و توصیف کا عمل ہے۔ بلکہ اسلامی تہذیب و ثقافت کا ایک منفرد عنصر بھی ہے۔ ہر دور میں عربی، فارسی اور اردو میں شعرائے کرام نے امام الانبیا، علیہ السلام کے حضور نذرانہ نعت پیش کیا۔ نعت ہمارے شعر و ادب کے قابل قدر روایت ہے۔ جمیل یوسف نے محبوب خدا، رحمت عالم، رہبر کامل، خیر البشر، فخر موجودات، وجہ تخلیق کائنات، مرقع سیرت و کردار، محسن انسانیت سید کونین ﷺ کی اعلیٰ و ارفع ذات پر عقیدت و محبت کے پھول نچھاور کئے۔ تاکہ قاری آنحضرت ﷺ کے کردار و عمل کی روشنی میں اسلام کی اخلاقیات کی اساس استوار کریں۔ آپ بھی ان پھولوں کی معطر خوشبو سے جذبے کی بیکرانی، شمائل باطنی و تعلیمات، مرکز صدق و صفائے عقیدت و محبت سے روح کو

مشکبار و پر بہار کریں۔

جو ہر اک بات سے اچھی ہے وہ ہے صرف بات اس کی
وہ ہر اک دور میں خورشید کی صورت چمکتا ہے
ترقی جو کسی نے کی اسیؑ کی راہ پر چل کر

جو ہر اک نام سے پیارا ہے وہ ہے نام اسؑ کا
زمانے کی جبیں پر ثبت ہے نقش دوام اسؑ کا
کیا تاریخ میں اقوام نے یوں احترام اسؑ کا

☆

ہر عالمِ امکاں ہے اسیؑ ذات سے پیدا
انساں پہ ہے اس ذات کا کتنا بڑا احساں
ہے اسؑ کی نظر واقف، ہر اوّل و آخر

وہؑ آئینہ ہے مطلعِ انوارِ دو عالم
یہ راندہ۔ فردوس ہے شہکار دو عالم
ہے اسؑ کی جبیں کاشف اسرارِ دو عالم

☆

ساری دنیا کو عطا کر گیا منزل کا شعور
اسؑ کے اجمال کی تفسیر رقم کیا ہو گی
کب ہوئی نعت میں الفاظ کی حسرت پوری

خلوت غار حرا سے وہ ستارہؑ نکلا
جو تصور بھی کیا ہم نے ادھورا نکلا
کب رہ شوق میں ارمان قلم کا نکلا

وہ کسی نے درست ہی کہا ہے "شاعری جزویست از پیغبری" جمیل یوسف نے جذبات و احساسات کو جس صدق دل سے پیش کیا۔ اس میں پاکیزگی خیال قابل رشک اور لافانی اقدار کی حامل ہے۔ علم و ادب اور فن و ہنر کو پرکھنے کا یہی وہ حقیقی معیار ہے۔ جس سے ہم کسی فنکار کی بڑائی کا تعین کر سکتے ہیں۔ میں بڑے اعتماد سے کہہ سکتا ہوں کہ آج کے عہدِ جدید میں اس نے غزل کی قدیم کلاسیکل روایات کو آگے بڑھاتے ہوئے اپنی تہذیب اور روح عصر جس نئے فطری اسلوب' نئی تشبیہات' دانشورانہ انداز و تلازمات' رنگارنگ پیراہن' ہنر مندی اور انفرادیت سے قلم بند کیا ہے وہ اسے اپنے دور کے صف اوّل کے شعراء میں بھی ممتاز کرتا ہے۔

ڈاکٹر زہرہ اعظم

پرتو روہیلہ شاعری و شخصیت

پرتو روہیلہ کی شخصیت جتنی متنوع ہے۔ اتنی ہی رنگارنگی ان کی تخلیقات میں بھی ہے۔ بیوروکریٹ ٹینس کرکٹ، شکار، شطرنج کے کھلاڑی اور پھر یار باشی کے رسیا۔ تخلیقی میدان میں ان کے تجربات غزل، دوہے اور نظم کی وسعتوں کو عبور کر کے اردو نثر میں داخل ہو گئے اور پھر انہوں نے اردو ادب کو ایک ایسا رواں دواں جیتا جاگتا پر فکر و پر مزاح سفر نامہ دیا۔ جو نہ صرف سفر نامہ نگاری میں اپنی حق گوئی، حس مزاح اور وطن پرستی میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ بلکہ جو اردو نثر نگاری میں بھی اپنی مثال آپ ہے۔ سو پرتو روہیلہ پر جب بات ہو تو کوئی قاری کسی ایک صنف ادب پر بات کر کے حق گویائی ادا نہیں کر سکتا۔ تاوقتیکہ ان کی تخلیقات کی ساری جہتوں پر بات نہ کرے۔ یہی وجہ ہے کہ عمائدین ادب نے ان کی ہر تخلیقی جہت پر بڑی تفصیل سے لکھا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا، سید ضمیر جعفری، ڈاکٹر نثیق بابری، کامل القادری اور رجا چشتی نے ان کے دوہوں پر ایسے مضامین لکھے ہیں کہ جو کسی بھی تخلیق کار کے لیے باعث فخر و مباہات ہو سکتے ہیں۔ ''رین اجیارا'' ان کے دوہوں کا وہ مجموعہ ہے جس کے مختصر وقت میں پے در پے تین ایڈیشن چھپے۔ طباعت کے وقت ''رین اجیارا'' پاکستان میں دوہوں پر مشتمل پہلی کتاب تھی۔ یہ مضامین اس صنف میں شاعر کی فنکاری، یگانگت اور تازہ کاری پر بحث کرتے ہیں۔ ان مضامین کو پڑھتے ہوئے احساس ہوتا ہے کہ شاعر نے دوہے جیسی محدود صنف سخن کو کتنی وسعت دی ہے اور اس مختصر آنگن میں افکار کے کیسے باغ لگائے ہیں۔

دوہوں کو عنوان سے آشنا کرنا بھی پرتو روہیلہ ہی کی اختراع ہے۔ ''جیون'' کے زیر عنوان یہ دوہے دیکھیے۔

ساگر سے جب کوئی ابھاگن بوندا لگ ہو جائے
سورج تاپے بھاپ بنے، پھر برسے تب مل پائے

دونوں مٹھی بھینچ کے روکوں، پھر بھی نہ کچھ بن پائے
جیون کی یہ چکنی ڈوری ہاتھوں نکلی جائے

دو دوہے ''دو بازو'' کے زیر عنوان ملاحظہ کیجیے۔

یوں تو اس پھلواری اندر ہر ہر ڈال سہائے
پھر بھی پرتو سچ مانو تو دو ہی بازو ہائے

ایک تو وہ جو دیس کے کارن اٹھے اور کٹ جائے
دوجا وہ جو میت کے سر کا سرہانا بن جائے

ڈاکٹر وزیر آغا نے پرتو روہیلہ کی وسعت فکر اور پرواز خیال پر بحث کرتے ہوئے کہا ہے کہ پرتو روہیلہ کے دوہوں سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ''انہوں نے کس خوبصورتی سے دوہے کی فرنگ اور کلچر کو اپنے دوہے کا جزوِ بدن بنایا ہے۔ انہوں نے محض سنی سنائی اور پیش پا افتادہ باتوں سے اپنے دوہوں کو نہیں سجایا بلکہ دوہے کے پورے کلچر پر غور کر کے پہلے ان تمام رنگوں اور خوشبوؤں کو اپنے اوپر وارد کیا ہے۔ پھر خود کو ان میں سمویا ہے۔ پھر یوں من تو شدم تو من شدی کے عمل سے گزر کر ایسے دوہے لکھے ہیں۔ جن میں زبان کی شیرینی بھی ہے اور الفاظ کی کھنک بھی۔ خیال کی لطافت بھی ہے اور گمبھیرتا بھی اور تجربے کا وہ لمس بھی ہے جس کے بغیر فن کی تخلیق ناممکن ہے۔''

نظم پرتو کی دوسری تخلیقی جہت ہے۔ اس میدان میں بھی انہوں نے اردو ادب کو اعتبار و ابتکار سے ہمکنار کیا اور ہماری شاعری کو چند ایسی لازوال نظمیں دیں جن کی تازگی اور ندرت خیال کبھی زوال آشنا نہیں ہو سکتیں۔ ''آواز'' ان کی نظموں کا مجموعہ ہے۔ اس مجموعے کی دس نظموں کا ترجمہ ڈاکٹر اکرام اعظم نے خوبصورت انگریزی میں کر کے حال ہی میں انگریزی کے ادبی مجلّے Pakistan Pictorical میں طبع کرایا ہے۔ پروفیسر جیلانی کامران، ڈاکٹر انوار سدید اور پروفیسر احسان اکبر نے ان کی نظم پر سیر حاصل مقالے لکھے ہیں اور ''آواز'' کی نظموں کو نظر میں رکھتے ہوئے ان کے گہرے مشاہدے، منفرد لفظیات اور موضوع کی بنت اور ماحول سے ہم آہنگی کی نشاندہی کی ہے۔ اس مجموعے کی دو نظموں کو آپ بھی سنئے اور شاعر کے دردِ دل کے ساتھ ہی اس کی ندرت خیال کی داد دیجئے۔

کارِزار

نحیف چڑیا، حسین چڑیا، جمیل چڑیا
کسی شکاری کا گھاؤ کھا کر نجانے کب سے سڑک کنارے پڑی ہوئی تھی
پھڑک رہی تھی
تڑپ رہی تھی
مری نہیں تھی۔
زمیں سے اس کو اٹھا کے میں نے قریب ہی اک درخت کی شاخ پر بٹھایا
کہیں سے چلو میں پانی لا کر اُسے پلایا
وہ سانس دینے کا اک طریقہ کبھی جو بچپن میں میں نے سیکھا تھا آزمایا
تو چند لمحوں میں اس نحیف و نزار چڑیا نے سر اٹھایا

ابھی میں اپنی یہ ہستی کی تھی نیکی پہ آفرین بھی نہ کہہ سکا تھا
کہ میں نے چڑیا کو جست بھرتے ہوا میں دیکھا
ہوا سے چڑیا جو واپس آئی
تو اس کی ننھی سی چونچ میں اک حسین تتلی دبی ہوئی تی
حسین تتلی، جمیل تتلی
نحیف تتلی، نزار تتلی
پھڑک رہی تھی
تڑپ رہی تھی
مری نہیں تھی

پن کشن

مرے پن کشن میں بہت سی پنیں ہیں
اور اکثر پنیں اس میں ایسی ہیں جو
دور انجانے ملکوں سے آئے ہوئے خطوں سے نکالی گئی ہیں
مگر اس گھڑی ایک ظاہر حقیقت کی صورت مرے، پن کشن میں لگی ہیں
اگر پن کشن کی ہر ایک پن یہ سوچے
کہ میں تو فلاں دیس کی ہوں
فلاں دیس نے میری صورت گھڑی تھی
فلاں دیس نے میرا لوہا جنا تھا
تو یہ سوچنا پن کشن کی حقیقت کو خطرے میں ڈالے نہ ڈالے
پنوں کو یقیناً جڑوں سے ہلا دے گا
اور پھر یہ ساری پنیں، بے سکت، بے جہت، بے ہدف
یونہی رلتی پھریں گی

''نوائے شب'' کی نظموں کی طرف اشارہ کر کے ڈاکٹر جمیل جالبی کہتے ہیں کہ یہ ''اس شاعر کا کلام ہے جو ایک لمبا سفر

طے کر کے یہاں تک پہنچا ہے، جس نے تضاد میں ہم آہنگی پیدا کر کے ایک نئے سخن کی داغ بیل ڈالی ہے۔ قومی مسائل کو جس تخلیقی شان کے ساتھ سامنے لاتا ہے وہ نئی شاعری کے لیے کھلا راستہ ہے۔ میں ''پن کشن'' اور ''وارفتگی'' کی طرف آپ کی توجہ دلاؤں گا تاکہ نئی شاعری کا نیا رنگ جس میں ماضی اور حال مل کر مستقبل کے سامنے نئے سوالوں کو جنم دے رہے ہیں آپ کے سامنے آجائیں۔ یہ ماضی کے ٹمٹماتے چراغ، احساس کے صحرا شکست خواب، سماجی مسائل کے شعور اور حقائق سے آنکھیں چار کرنے کی شاعری ہے۔''

ان نظموں کے متعلق ڈاکٹر انور سدید فرماتے ہیں ''پرتو روہیلہ معمولی کو غیر معمولی بنانے کے لیے صورت واقعہ کو خوبی اور خوبصورتی سے استعمال کرتے ہیں۔ وہ زبان کو آرائشی انداز میں استعمال نہیں کرتے بلکہ حقیقت کے پس پردہ ایک اور حقیقت دریافت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ انہوں نے نظم کے ظاہر کو اولین تخلیقی جست ہی میں کہانی سے پیوست کر دیا ہے اور کہانی کو منظوم نہیں کیا بلکہ معانی کی گئی پرتیں پیدا کر کے حقیقت کی نئی صورتیں آشکار کی ہیں۔ یہی خوبی انہیں موجودہ دور کے شعراء سے منفرد قرار دیتی ہے اور اسی سے ان کی نظم کے تشخص کا احساس ہوتا ہے اور وہ ایک نئے ذائقے کا شاعر محسوس ہوتا ہے۔''

سید ضمیر جعفری ان نظموں کے متعلق یوں رقم طراز ہیں۔ ''میرے نزدیک یہ نظمیں اجتماعی خوابوں کا نوحہ ہیں مجھے ان میں وہ آگ نظر آتی ہے۔ جس کے شعلوں میں ہمارے شہر، قصبے، گلیاں اور گھر جل رہے ہیں۔ یہ شاعر انصاف اور سچائی کی چتا پر ننگے پاؤں چل رہا ہے اور جیالے پن کی یہی ادا ہے۔ جس میں ہم اپنی اجتماعی ذات کے تینوں روپ دیکھ سکتے ہیں۔ وہ جو ہم تھے، وہ جو ہم ہیں اور وہ جو ہم ہوں گے۔''

غزل میں بھی پرتو روہیلہ نے ایک نئی طرح ڈالی تھی اور ایک ایسے رنگ سے ابتداء کی تھی جو اپنی گہری حسیت، دل گزیں تاثر اور ماحولی کیفیت میں یکتا و منفرد کہا جا سکتا ہے۔ یہ غزل کا ہندی انگ تھا اور ایسے وقت کہ جب کوئی دوسرا اس میدان میں نہ تھا۔ لیکن بقول جمیل جالبی کے پرتو روہیلہ کے طبعی تلون اور ان کے لاابالی پن نے یہ میدان بغیر کسی وجہ اور بغیر کسی احساس زیاں کے دوسروں کے لیے چھوڑ دیا۔ چنانچہ دوسرے نو واردانِ ادب اسے نہ صرف لے اُڑے بلکہ اس رنگ اور لہجے کے مخترع و موجد ہونے کے دعوے دار بھی بن بیٹھے۔ پچاس کی دہائی کی کہی ہوئی یہ غزلیں آج بھی اس رنگ اور انگ میں بے مثال پارے ہیں ''پرتو شب'' کی ان غزلوں کے چند اشعار آپ بھی سنئے۔

ماتھے ماتھے چندا دیکھے ٹھوڑی ٹھوڑی تارے
روپ کی جھلمل مایا تیرے تیور تیکھے روپ نیارے

سانس کی ایسی نرم چھری سے کٹتی ہے یہ جیون ڈوری
جینے والے کتنے بھولے پھرتے ہیں چھاتی کو ابھارے

آٹھا او دل ختم ہوئی چوپال پہ چھایا سناٹا
یاد کا اک دکھیارا جھینگر رہ رہ کر ہر آن پکارے

بیتے سے کی ٹہنی پکڑے جھول رہے ہیں گہرے سائے
پورب پچھم کاوے کاٹے من کا پنچھی بیٹھ نہ پائے
چار گھڑی کا جیون اپنا اس نگری میں یوں ہے جیسے
گہری نیند سے چونکے بالک کروٹ بدلے اور سو جائے
اڑتے سے کے پنکھ سے جوگی بجھ جاتا ہے پیار کا دیپک
بوجھ کی ٹھنڈی بھوبل میں یہ پیت اگن بھی کجلا جائے

رفتہ رفتہ پرؔتو کے غزل کے مضامین ''روپ کی جھلمل مایا'' اور ''یاد کے دکھیارے جھینگر'' سے بدل کر ''سازشوں کی تند موجوں'' اور ''کٹ گیا آدھا بدن'' میں تبدیل ہو گئے اور اس تبدیلی کے سبب لفظیات میں بھی تبدیلی آئی جو بظاہر موضوعات کے نقوش ابھارنے کے لیے ضروری بھی تھا۔ چنانچہ اس دور کے بعد کی پرؔتو روہیلہ کی غزلیں ہمارے ملک کا سیاسی، سماجی، اخلاقی اور فکری ابتلاء کا کربناک منظر نامہ ہیں۔

سازشوں کی تند موجیں تھیں مرا ہلکا بدن
بارہا ڈوبا بھنور میں بارہا ابھرا بدن
سخت جانی تھی مری یا میں تن بے روح تھا
جی رہا ہوں آج بھی گو کٹ گیا آدھا بدن
دکھ تو مضمر ہی میری جان میں تھے
میرے دشمن مرے مکان میں تھے
سب شکاری بھی مل کے کیا کرتے
شیر بیٹھے ہوئے مچان میں تھے
میری آنکھوں کو خدا اتنی تو بینائی دے
مجھ کو دیوار پہ لکھا ہوا دکھائی دے
میں بھی انصاف کا طالب ہوں خدایا مجھ کو
حاکم وقت سے تھوڑی سی شناسائی دے
اے حسیں میں تو دعا گو ہوں جو کہتا ہوں تجھے
حسن کے ساتھ خدا دولت دانائی دے
رواقِ چرخ میں تیری نظر کو دیکھتا ہوں
غروبِ شمس طلوعِ قمر کو دیکھتا ہوں
یہ پوری نصف صدی کے عمل کا حاصل ہے
میں کشتِ زارِ ہوس کے ثمر کو دیکھتا ہوں
چلے تھے جب بھی وہی اک سوال سمت کا تھا
وہی سوال ہے اب بھی جدھر کو دیکھتا ہوں

چنانچہ ڈاکٹر توصیف تبسم، محسن احسان اور جمیل یوسف کو پرؔتو روہیلہ کی غزل میں فشارِ جذبہ، عصری حسیت اور گہری وطنیت نظر آتی ہے۔

مرزا ادیب اور ڈاکٹر رشید امجد نے پرؔتو روہیلہ کے سفرنامے پر مقالے لکھے ہیں۔ مرزا لکھتے ہیں ''پرؔتو روہیلہ نے اپنے سفرنامے میں اس روایت کو برقرار رکھا ہے جو مولوی محبوب عالم (پیسہ اخبار والے)، سرسید احمد خان، مولانا شبلی نعمانی جیسے بزرگوں کے ہاں محسوس ہوتی ہے۔ یہ بزرگ جہاں بھی گئے اپنے وطن کو نہیں بھولے۔ پھر ''سفر گشت'' کا مصنف کھلے دماغ کا مالک ہے۔ اس نے اپنے شعور کے دروازے کھلے رکھے ہیں اور جہاں حکیمانہ کلمات درج ہیں۔ وہاں مزاحیہ فقروں کی بھرمار

بھی ہے۔ پرتو روہیلہ کی حس مزاح خاصی تیز ہے۔ ''سفرِ گشت'' کو آپ سفر نامہ کہیں یا آپ بیتی کا حصہ جو کچھ بھی سہی یہ بہت دلچسپ کتاب ہے۔''

ڈاکٹر رشید امجد کا خیال ہے کہ ''سفر گشت'' ایک مختلف سفرنامہ ہے، جس میں نہ رومانیت زدگی ہے، نہ مصنوعی سنجیدگی اور بہروپ۔ یہ ایک شاعر کا سفرنامہ ہے، جس نے اپنی آنکھ سے چیزوں اور مناظر کو دیکھا ہے اور اپنے ذہن سے ان کے معنی متعین کئے ہیں۔ امریکہ اور لندن میں بھی سفر کرتے ہوئے وہ پاکستان کو نہیں بھولے۔ معنوی لحاظ سے اس میں بیسویں صدی کا ایک تجزیہ کار اور بیدار ذہن نظر آتا ہے۔ یہی بات اس سفرنامے کو انفرادیت بخشتی ہے۔ یہ صرف سفر نامہ ہی نہیں دو نقطہ ہائے نظر اور دو نظاموں کا جائزہ بھی ہے۔ یہی وہ پہلو ہے جو پرتو کی الگ پہچان بناتا ہے۔''

ممتاز مفتی پرتو روہیلہ کی شخصیت کے متعلق بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ ''جب پہلی بار مختار سے آمنا سامنا ہوا تو دیکھا ایک خوش شکل مخملی تمدن سے بھرپور آدمی ہے۔ کتابی چہرہ ہے۔ ''ہوکیرس'' سے اٹی ہوئی پیشانی ہے، وقار میں گندھا ہوا عجز ہے، عجز سے لت پت وقار ہے۔ مردانگی کا کلف لگا طرہ ہے۔ جس پر انسانی کناری لگی ہے۔ آنکھیں روئی روئی بھیگی بھیگی، ایسا طرفہ تماشا نظر آیا جیسے جھٹپٹے کا عالم ہو، دو وقت مل رہے ہوں...... یہ ساکن بھی ہے متحرک بھی، سادھو کی بھی ہے پرکار بھی، بلیک اینڈ وائٹ بھی ہے رنگدار بھی، پرتو تو بھی ہے مختار بھی، اکھڑ پن بھی ہے ساتھ ہی ملائم انسان بھی ہے۔ رئیسانہ سج دھج بھی ہے اور مفلسانہ جھجک بھی۔ شاہ بھی ہے درویش بھی، عاشق بھی ہے محبوب بھی۔''

غرض ان مضامین اور خاکوں سے جو ان کے معاصرین اور ہم نشینوں نے وقتاً فوقتاً ان کی شخصیت پر لکھے ہیں۔ وہ ایک بیوروکریٹ، درویش صفت، قلندر طبع، دوست باش، بلند نگاہ، انتہا پسند، کم آمیز، دیر آشنا، غیور، منکسر مزاج، مادی اقدار سے لاپروا، مخلص دوست، زودرنج، دنیاداری سے ناآشنا وغیرہ وغیرہ قسم کی شخصیت ظاہر ہوتے ہیں۔ غور کیجئے تو مفتی صاحب کے بقول ایک عجیب مجموعۂ اضداد لیکن یہ سارے تضادات انتہائی خوش خلقی اور خوش اسلوبی سے اس طرح سمیٹے ہوئے کہ آپ برسوں ان کے ساتھ رہیں تو اندر کا حال معلوم نہ ہو۔ لیکن مجھے تو گلہ ان کی لاپرواہی اور لاابالی فطرت کا ہے۔ اس کو اگر آخری درجے کا استغنا بھی کہیں تو زیادہ صحیح ہوگا۔ بلکہ اگر اس کو قلندری کہیں تو اور بھی مناسب ہے میں نے ان کو انتہائی نازک حالات میں کہ ہمارے سینکڑوں حق کے علمبردار ''جی حضور'' کے علاوہ منہ سے کچھ نہ کہہ سکتے تھے، عمائدین وقت سے بے باکی سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتے دیکھا ہے اور انہیں اپنے رویہ پر ذرہ برابر بھی افسوس نہیں۔ نتیجتاً حکومت کے انتہائی با اثر حلقوں میں رہنے کے باوجود اکثر حاکمانِ وقت سے شدید شاکی رہے اور کارمندان حکومت سے کوئی پی آر نہیں رکھی۔ ان کی طبیعت کی یہ شدت کافی حد تک ادبی حلقوں میں بھی ظاہر ہوتی رہی۔ اپنی نام نمود یا شہرت کے لیے انہوں نے کبھی بھاگ دوڑ نہیں کی اور نہ ہی سیاسان ادب سے اپنی شہرت کے لیے کوئی تعلق رکھا۔ چنانچہ ہمارے عہد کے جوہریوں نے بھی ان سے

غفلت برتی اور ان کو ان کا صحیح مقام نہیں دیا۔ لیکن ان کو شاید اس کا احساس ہی نہیں۔ وہ آج بھی انتہائی خاموشی اور تندہی سے گوشۂ تنہائی میں بیٹھے کام کئے جارہے ہیں۔ ہر سال نہیں تو دوسرے سال ضرور ان کی کوئی نہ کوئی تخلیق وارد ہو جاتی ہے جس کی کوئی تقریب نہیں ہوتی۔ البتہ وہ ان کے گنے چنے دو چار دوستوں میں ضرور متعارف ہو جاتی ہے۔ جن کے طفیل بعض ادبی پرچوں میں ان پر تبصرہ آ جاتا ہے اور بس۔ بلکہ جب سے وہ غالب کے سحر میں گرفتار ہوئے ہیں۔ ان کا راستہ بھی عمومی ادبی راستوں سے قدرے مختلف ہو گیا ہے۔ اب وہ غالب کی کلاسیکی فارسی کو آسان و عام فہم اردو میں ڈھالنے کے درپے ہیں اور شاید وقت ملنے پر غالب کو اقلیم فارسی میں بہ حیثیت فارسی شاعر اس کا صحیح مقام دلانے کے بھی۔ چنانچہ فی الوقت صورت حال یہ ہے کہ ان کا کوئی ذکر اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا۔ جب تک ان کی غالب شناسی کی بھی بات نہ کی جائے۔

ان کی سیمابیت ان کو غالب کے فارسی خطوط کے میدان میں لے گئی۔ اگرچہ ان کے بقول اس میدان میں وہ اپنی مرضی سے نہیں گئے۔ بلکہ مشفق خواجہ نے اس کو اس قصر طلسمات میں دھکیل دیا۔ البتہ اب وہ اس قصر طلسمات میں قیام پذیر اپنی مرضی ہی سے ہیں۔ ان سے پوچھئے تو کہتے ہیں کہ ''میں محصور اس لیے ہوں کہ مسحور ہو گیا ہوں۔ پہلے غالب کی نظم کا شکار تھا اب ان کی فارسی نثر کا قیدی ہوں۔ گویا کئی زندانوں میں قید ہوں۔ فرار کی کوئی صورت نظر نہیں آئی۔'' بات بھی سچ ہے فرار کی صورت اس لیے نظر نہیں آتی کہ ''نامہ ہای فارسی غالب'' کے فارسی خطوط کے (جو غالب کے کلکتے کے سفر اور قیام میں لکھے گئے تھے) ترجمے کے فوراً بعد ''ماثر غالب'' کے خطوط کا ترجمہ ادارۂ یادگار غالب نے طبع کر دیا۔ اس کے بعد فوراً ہی ''باغ دودر'' کا کہ آثار غالب میں ان کے فارسی خطوط کی آخری دریافت ہے، ترجمہ چھپ کر سامنے آ گیا۔ اب یہ شنید ہے کہ غالب کے فارسی خطوط کی سب سے بڑی اور وقیع کتاب پنج آہنگ کے آہنگ پنجم کا ترجمہ بھی جس میں ان کے 129 فارسی خطوط ہیں، ادارۂ یادگار غالب کراچی سے چھپ چکا ہے اور منصۂ شہود پر آ چکا ہے۔ فارسی مکاتیب کی اس پیہم کاوش پر تفہیم غالب مستزاد ہے۔ جس کے طفیل اگست 2002ء میں غالب کے 392 مشکل اردو اشعار پر مشتمل ایک ایسی شرح جو تمام متداول شرحوں سے بوجوہ ممتاز و مختلف ہے۔ نقوش پریس لاہور سے چھپ کر غالب شناسان عصر سے داد حاصل کر چکی ہے۔ جبکہ پرتو کا ''نامہ ہای فارسی غالب'' کا ترجمہ اس قدر مقبول و معروف ہوا کہ ادارۂ ادبیات اردو حیدر آباد دکن کے موقر ماہ نامے ''سب رس'' نے اس ترجمہ کی پذیرائی بڑے توصیفی انداز میں اپنے اداریے میں کر کے اس کو بالاقساط اپنے مجلّے میں طبع کیا اور مدیر ''سب رس'' نے انتہائی ذوق وشوق سے اس ترجمے کو دوبارہ طبع کرنے کی اجازت مترجم اور ادارے سے طلب کی۔ اب ہم سب کی نظریں فردا کے ادبی افق پر ہیں اور ہم اس کے منتظر ہیں کہ پرتو کا دوسرا کون سا صحیفہ شرف نزول حاصل کر کے دولت علم وادب میں اضافے کا سبب بنتا ہے۔ ہماری بہر حال دل سے یہ دعا ہے کہ وہ اپنے تمام مقاصد کے حصول میں کامیاب و کامران ہوں اور خزانۂ علم وادب میں اسی طرح اضافے کرتے رہیں۔

(پروین جاوید)

دھیمے لہجے اور حقیقی جذبوں کا شاعر

"بے صدا بستیاں" کے شاعر ایسی دنیا کے باسی ہیں جہاں لوہے کی گھن گرج اپنے پورے زور و شور کے ساتھ فضا تک کو جھنجھوڑتی رہتی ہے لیکن "بے صدا بستیاں" کے خالق کو پھر بھی بستیاں خاموش اور بے صدا لگ رہی ہیں۔ کیونکہ دراصل یہ ان کے اندر کی بستیاں ہیں جو ان کے دل و دماغ کو کسی نہ کسی زاویے سے اداس اور بے صدا لگتی رہتی ہیں۔ کیونکہ وہ حساس اور گداز دل رکھنے والے شاعر ہیں۔ سچے کھرے اور دھیمے لب و لہجے، پروقار اندازِ گفتگو، اظہارِ بیان میں تمکنت رکھنے والے اس شاعر کا نام جاوید منظر ہے۔ یہ خوبیاں صرف ان کی گفتگو کا ہی خاصا نہیں بلکہ وہ اپنے سچے جذبوں اور وارداتِ قلبی کو روایت سے بندھی ہوئی جدیدیت کے ساتھ اشعار کے قالب میں ڈھال کر قاری کا دل موہ لینے میں بھی ملکہ رکھتے ہیں۔ ان کا قاری ان کے کلام پر سرسری نظر ڈال کر آگے بڑھ جانے کی ہمت نہیں کر سکتا۔ ان کے اشعار کی سچائی، برجستگی، سادگی اور نازک احساسات قاری کا دل و دماغ اپنے شکنجے میں اس طرح مقید کر لیتے ہیں جس طرح کلی اپنے اندر زردانے کو۔

سدا ہم نے ہی ترسایا بہت ہے — وگرنہ آپ نے چاہا بہت ہے

☆

انا ہے غم سے چہرہ آدمی کا — مزہ اب کیا رہا ہے زندگی کا

☆

پہلی سی وہ بات پھر نہ ہو گی — شیشے میں تو بال ہی رہے گا

☆

رات دن نفرتوں میں پلتا رہوں — کیا یہی زیست کا تقاضا ہے

☆

جاوید منظر کے یہاں یاس والم اور دکھوں کے سائے بھی جابجا پائے جاتے ہیں۔ جاوید منظر کے اشعار میں پایا جانے والا دکھ اپنا دکھ ان کا تجربہ ان کا کرب اپنا کرب، ان کا کٹھن سفر اپنا سفر اور اپنی زمین سے محبت کا جذبہ اپنا جذبہ اور معاشرہ میں پایا جانے والا احساس محرومی قاری کو اپنا جذبہ محسوس ہوتا ہے۔ یہ اپنے دھیمے دھیمے، نپے تلے انداز میں اپنے احساسات کا اظہار نہایت سکون برجستگی اور سچائی سے کر دیتے ہیں۔ چاہے لوگوں کو ان کا سچ پسند آئے یا نہ آئے۔

اپنی فطرت میں ازل سے ہی جبیں سائی نہ تھی   لاکھ چاہا کہ درِ شوق پہ سجدہ ٹھہرے

☆

جن پھولوں کو مُرجھانا ہے   اُن کی خوشبو کیونکر رکھنا

☆

تشنگی، ویراں دریچے، مفلسی، آہ و بکا   اے امیر شہر اس منظر کا بھی دیدار کر

☆

زندگی کے تلخ حقائق کا شعور ان کے اشعار میں بدرجہ اتم موجود ہے۔

☆

چاہتوں کا وہاں وجود کہاں   خواہشوں کا جہاں شمار نہیں

جاوید منظر کی شاعری میں احتجاج اور فریاد بھی نرم اور دھیمے لہجے میں ہے۔ بغاوت کے لہجے کا ان کے یہاں گزر نہیں پایا جاتا۔

بس وہی کیوں پسند ہے مجھ کو   جو مری دسترس سے باہر ہے

☆

آندھیوں میں کبھی جلتے نہیں مانگے کے چراغ   کیسے طوفاں میں بھلا اپنا سفینہ ٹھہرے

☆

بے حسی حد سے بڑھتی جاتی ہے میں کس سے کہوں   اجنبی شہر میں کوئی تو شناسا ٹھہرے

☆

کار زار حیات میں اکثر   ہم کو اپنوں نے دی ہے رسوائی

☆

چاہا تھا بہت نباہ ہم نے   اس بات کی کیا اُسے خبر ہے

☆

جاوید منظر نے غزل میں اظہار کے جو زاویے اپنائے ہیں وہ جدیدیت پر مبنی ہیں۔ اس لیے ان کے بارے میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ وہ جدید دور کے شاعر ہیں۔ اسی لیے وہ حالات میں تیزی سے پیدا ہونے والے تغیرات سے کہیں بھی ٹھٹکتے ہوئے محسوس نہیں ہوتے۔ بلکہ اپنے نپے تلے فن کا کٹھن سفر نہایت سبک روی سے طے کر رہے ہیں۔ انہوں نے اپنے منفرد انداز سے احساسات اور تجربات کو جدیدیت کے قالب میں ڈھال کر ندرکاری کیا ہے۔

جس کو ہر گام پہ ہر حال میں اپنا جانا   کیوں وہی شخص مری زیست کا نوحہ ٹھہرے

☆

تو مجھے چاہے مگر میں تجھے چاہوں کیسے   بات جب ہے مرا دل بھی ترا پیکر کھینچے

☆

ہاں شہر خموشاں میں کوئی مجھ سا بھی ہو گا   ناموں کا تو ہر قبر پہ پتھر نہیں ہوتا

☆

ایک ہی پل میں سمٹ جائے سفر صدیوں کا   یوں نگاہوں میں قیامت کا وہ منظر کھینچے

☆

جاوید منظر کی شاعری میں روایت پسندی اور جدت پسندی کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ ان کے یہاں ایک طرف اگر الفاظ اور تحصیل کا ذخیرہ بھی ہے تو دوسری طرف مشاہدات، وارداتِ قلبی اور حقائق زیست کا انتہائی شعور بھی ہے۔ انہیں زندگی سے محبت ہے اور زندہ لوگوں سے محبت ہے۔ وہ زندگی کو تمام حشر سامانیوں کے ساتھ گزارنے کے خواہشمند بھی ہیں اور یہ تمام خواہشیں، جذبے اور احساسات نہایت شگفتہ، دلکش اور سادہ انداز میں پیش کرتے ہیں۔ زبان و بیان کی دلکشی ان کے کلام کو مزید پر اثر بنا دیتی ہے۔

بوئے گل کھینچے نہ گلشن میں گل تر کھینچے   شوقِ دیدار ترا ہم کو ہے در در کھینچے

☆

حشر برپا کیا جدائی پر   کس قیامت کی چشم تر ٹھہری

☆

لوگ فکرِ معاش میں گم ہیں — بے خبر موسموں میں اُلجھا ہے

☆

سب نے ہی اُسے نگہ میں رکھا — اور اُس کی نگاہ کو نہ جانا

☆

گھر کو جب گھر ہی نہ سمجھیں گے مرے گھر والے — پھر تو کچھ روز میں آ جائیں گے باہر والے

☆

پہلے بھی بہت اشک سنبھالے تھے مگر آج — موتی وہ ملے ہیں کہ پرونا نہیں اچھا

☆

جس نے مری انا کو نہ رہنے دیا انا — میں ایسا حرف، حرفِ دعا کیسے مان لوں

☆

نشانۂ ستمِ روزگار تھا، پر اب — دکھوں کا زہر مرے جسم و جاں میں پلنے لگا

☆

پھر اس کے بعد نہ کہنا صدا بہ صحرا تھی — میں اپنی بات کا تجھ پر اثر بھی دیکھوں گا

☆

بچھڑنا ہے تو مت الفاظ ڈھونڈو — ہمارے واسطے لہجہ بہت ہے

☆

دورِ خزاں میں جشنِ بہاراں دکھائی دے — اب چاک چاک اپنا گریباں دکھائی دے

☆

جاوید منظر کے یہاں یادوں کی رنگینیاں اور ان کی کسک بھی جابجا پائی جاتی ہے۔ ان کا طرزِ احساس، جدید بھی ہے اور فکر انگیز بھی۔ مثال کے طور پر یہ اشعار دیکھیے۔

جانِ محفل سے بچھڑ کر یہ کھلا — ہم تو خود گم کردہ منزل ہو گئے

☆

دن یوں بھی گزارتا رہوں گا — خوابوں کو سنوارتا رہوں گا

☆

خیالِ خاطرِ ابرِ بہار کر نہ سکے
خزاں نے لوٹ لیا اب کے گھر کا گھر کیسا

☆

یہ وہ پرند ہے کہ نہیں جس کا آشیاں
اندازہ ہو گیا ہمیں اس کی اڑان سے

☆

ساتھ چلتے ہو تو کچھ ہم پہ بھروسہ بھی کرو
یہ نہ سوچو کہ فقط چلنے سے کیا ملتا ہے

☆

جاوید منظر اپنے اطراف کے ماحول سے بیگانہ نہیں وہ اپنی ثقافت، اخلاقی اقدار، معاشرتی اقدار اور جذباتی رویوں سے شعوری طور پر آشنا ہیں۔ زمین سے محبت کی سرشاری ان کے اشعار میں جابجا پائی جاتی ہے۔ جس کی خوشبو قاری کو بھی محسوس ہوتی ہے۔ جاوید منظر کے شگفتہ اور تازگی سے بھرپور لہجے میں معاشرے کے دکھوں کی آئینہ داری ان کے انتہائی حساس انسان ہونے کا ثبوت ہیں۔ وہ ایک گداز دل رکھنے والے شاعر ہیں جس کا اثر ان کے اشعار میں ہمیں اکثر ملتا ہے۔

تم گئے وقت کے مانندے رہے خوش منظر
بارِ غم لوگ نئی نسل کے ڈھوتے ہی رہے

☆

منظر اگر وطن کی سیاست یہی رہی
ہوں گے وہ محترم جو کمینے ہیں آج کل

☆

زندگی راستہ بدلتی ہے
راستہ خود کہاں بدلتا ہے

☆

اب ایسے میں کہاں ممکن رہا ہے
پہنچنا روشنی تک روشنی کا

☆

کل فصل یہ ہم کا کاٹنا ہے
جو خوف ہم آج بو رہے ہیں

☆

میں جس زمیں کا فرد ہوں ازل سے گردشوں میں ہے
مرے خیال و فکر میں بھلا ثبات کیسے ہو

☆

ظلم پر احتجاج کرنا سیکھ　　اس طرح جسم و جاں نہال نہ کر

☆

بارود کی وہ بو تو گلابوں میں بس گئی　　بے وجہ بند کرتے رہے کھڑکیوں کو لوگ

☆

مت کرو ہجرت کہ ہر گلدان میں　　پھول مُرجھاتا تو ہے کھلتا نہیں

☆

منظرؔ ہمارا شہر کراچی اُداس ہے　　دفنا رہے ہیں روز کئی ساتھیوں کو لوگ

☆

جاوید منظرؔ سیاست دوراں اور معاشرے کی حریف قوتوں کے مزاحمتی کردار اور استحصالی رویے سے بھرپور واقف ہے اور ان تمام حالات سے پہنچنے والا دُکھ انہیں اپنا دُکھ محسوس ہوتا ہے۔ وہ ظلم و جبر اور استبداری قوتوں کے خلاف اپنے خاص اسلوب اور پیرایۂ اظہار سے آواز اُٹھاتے ہیں۔ وہ شکوہ بھی کرتے ہیں تو مہذب لہجے میں۔ ان کی شاعری میں عصری شعور کا بھرپور تاثر موجود ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری میں جو بھی موضوع اپنایا اسے نہایت سلیقے اور مہارت سے نبھایا ہے۔ وہ ظلم و جبر و استبداد پر بے لاگ تبصرہ کرنے سے نہیں گھبراتے اور بھرپور انداز میں ظالم و جابر حکمرانوں کو اپنی شاعری میں تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔

حاکمِ وقت، دلوں پر تھی حکومت اُن کی　　ہم نے ایسے بھی کئی خاک بسر دیکھے ہیں

☆

ان گلی کوچوں پہ یہ وقت بھی آیا منظرؔ　　شہر والوں کے بدن خون میں تر دیکھے ہیں

☆

اگر ہمت سے لیتے کام ہم لوگ　　نہ قلعہ ظلم کا تعمیر ہوتا

☆

امیرِ شہر سے بس ہے یہی گلہ منظرؔ　　غریبِ شہر کو اُس کی زبان دے جاتا

☆

نہ جانے کب سے زمانہ ہے گوش برآواز　　کوئی بلالؓ یہاں بھی اذان دے جاتا

☆

جس میں بس جائے مرے پیار کی بستی منظر
چاہتا ہوں کہ ملے ایسی مثالی دنیا

☆

دلوا سکے نہ جب بھی سزا مجرموں کو لوگ
واپس ہوئے بہ دیدۂ پُرنم گھروں کو لوگ

☆

دیکھیں امیرِ شہر کی یہ بھی نوازشیں
اکثر گلے لگاتے رہے وحشتوں کو لوگ

☆

انصاف کی وہاں یہ توقع فضول ہے
حقدار کہہ رہے ہیں جہاں غاصبوں کو لوگ

☆

اُن کے خلاف کوئی گواہی نہ دے سکا
پہچانتے تھے یوں تو سبھی قاتلوں کو لوگ

☆

جاوید منظؔر کو اپنی فکر اور زندگی کے تلخ حقائق پر یقین اور اظہار کی دولت میسر آ چکی ہے۔ وہ آپ بیتی میں جگ بیتی بیان کرنے کا ملکہ رکھتے ہیں۔ وہ عصری شعور رکھنے کے ساتھ ساتھ ماضی کا ادراک بھی رکھتے ہیں۔ جو ہر شخص کو حاصل نہیں ہوتا' میری دعا ہے کہ جاوید منظؔر ''خواب سفر'' ''بے صدا بستیاں'' اور ''مرے دل پہ کعبے کا در کھلا'' کی طرح ادب کی دنیا میں چکا چوند پیدا کرتے رہیں۔ آمین

فوزیہ تبسم

صوفی غلام مصطفےٰ تبسم کی ۲۹ ویں برسی کے موقع پر

عظیم استاد شاعر صوفی تبسم کی ۲۹ ویں برسی ادبی بیٹھک (الحمراء) لاہور آرٹس کونسل میں ۱۸ فروری ۲۰۰۷ء کو منائی گئی۔ تقریب کے آغاز میں فوزیہ تبسم نے صوفی صاحب کے حوالہ سے مبسوط مقالہ پیش کیا۔ اس کے بعد نیلما درانی نے صوفی صاحب کو خراج تحسین پیش کیا۔ انہوں نے کہا کہ صوفی صاحب کی صدارت میں اپنا پہلا مشاعرہ پڑھا تھا اور انہی کی حوصلہ افزائی کے باعث وہ مزید آگے بڑھیں۔ زاہد مسعود نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ الحمراء آرٹس کونسل کے پہلے چیئرمین ہونے کی حیثیت سے لاہور آرٹس کونسل اور حکومت کا یہ فرض ہے کہ ملک کے عظیم استاد نقاد، شاعر، ادیب، براڈ کاسٹر اور شرح غالب اور اقبال لکھنے کا حکومتی سطح پر دن منایا جائے۔ سلطانہ منور نے صوفی صاحب کو منظوم خراج تحسین ترنم سے پیش کیا۔ ان کے بعد وحید رضا بھٹی نے کہا کہ جب گورنمنٹ کالج میں راوی کا فارسی نمبر نکلا تو میں اس کا ایڈیٹر تھا اور میں اکثر صوفی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتا اور ان سے بہت کچھ سیکھنے کا موقع بھی ملا اور انہوں نے میری ہر طرح سے رہنمائی کی۔ فرخ زہرا گیلانی نے اپنی گفتگو میں حکومت کو یہ تجویز پیش کی کہ ہر سال صوفی صاحب کا دن منایا جائے اور اس کے ساتھ ساتھ کانفرنس کا انعقاد بھی کیا جائے تاکہ ملک کے دانشور اور ملک سے باہر سکالرز کو اس کانفرنس میں صوفی صاحب کے حوالے سے تحقیقاتی مقالہ جات پڑھنے کے لئے مدعو کیا جائے اور یہ مقالہ جات تمام سفارت خانوں کو بھی بھجوائے جائیں۔ اس طرح صوفی صاحب کے تعلیمی نظریات کی ترویج ممکن ہو سکے گی۔ عباس نجمی جو کہ میزبانی کے فرائض بھی سرانجام دے رہے تھے کہا کہ صوفی صاحب کا سب سے بڑا کارنامہ ان کی طرف سے غالب، اقبال کی شرح ہیں۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ ہمارے لئے اس سے بڑی شرم کی بات کیا ہوگی کہ ہر سال صرف صوفی تبسم اکیڈمی ہی صوفی صاحب کے حوالے سے پروگراموں کا انعقاد کرتی ہے جبکہ ان کے شاگرد دنیا کے کونے کونے میں موجود ہیں اور انہوں نے جو خدمات اپنے ملک کے لئے سرانجام دیں ان کو حکومتی سطح پر بھی فراموش کیا جا چکا ہے۔ ہم حکومت کے ارباب اختیار سے گوش گذار کریں گے کہ وہ صوفی صاحب کو ہر حوالے سے ان کا جائز مقام دیا جائے۔ اے۔جی جوش صاحب نے بھی صوفی صاحب کو اپنے مخصوص انداز میں خراج تحسین پیش کیا اور انہوں نے یہ بھی بتایا کہ صوفی صاحب نے آج کے بڑے بڑے شاعروں کو شاعر بنایا اور ان کی اصلاح بھی کی۔ نجیب احمد نے حاضرین کی توجہ صوفی صاحب کے بچوں کے حوالے سے شاعری پر دلائی اور کہا کہ ان کا مقام بہت بلند ہے۔ خالد احمد نے صوفی صاحب کے حوالے سے کہا کہ وہ ملک کے مایہ ناز شاعر، معلم، براڈ کاسٹر، ڈرامہ نگار اور پاکستان کرکٹ بورڈ کے پہلے چیئرمین تھے اور مینار پاکستان تعمیری کمیٹی کے بھی رکن تھے۔ انہوں نے فارسی کلام کی ترویج کے لئے خانہ فرہنگ ایران کی بنیاد بھی رکھی اور ٹی وی، ریڈیو پر درس اقبال کا اجراء کیا اور پطرس بخاری کی تحریک پر انہوں نے شیکسپیئر کے ڈراموں کے تراجم بھی کئے۔ یہ تمام کارنامے بھولنے والے نہیں ہیں۔ ناصر زیدی نے صوفی صاحب کے بارے میں کہا کہ وہ چھوٹوں کو بڑا بنانے والے تھے۔ ان کے ساتھ جب بھی میں ریڈیو ٹی وی کے پروگرام میں شامل ہوا انہوں نے ہمیشہ مجھ سے میزبانی کے لیے کہا جبکہ میں خود کو اس کا اہل نہیں سمجھتا تھا اور آج ہم میں جو حوصلہ اور خود اعتمادی ہے یہ صوفی

صاحب کی دین ہے اور انہوں نے اس کے ساتھ منظوم خراج تحسین پیش کیا۔ اس پر وقار تقریب کی صدارت شہزاد احمد نے کی اور اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ وہ صوفی صاحب سے عشق کرتے ہیں اور اپنی طبیعت خراب ہونے کے باوجود اس تقریب میں شامل ہوئے۔ وہ میرے استاد ہی نہیں اچھے دوست بھی تھے۔ وہ دوستی دوستی ہی میں ہمیں بہت کچھ سکھا دیتے تھے۔ صوفی صاحب کا انداز بیان اس قدر خوبصورت تھا کہ وہ بولتے رہیں اور ہم سنتے رہیں۔ ایسا ادبی جینئس صدیوں میں پیدا ہوتا ہے باوجود اس کے وہ خود کو بڑا نہیں سمجھتے تھے۔ وہ سب کے دوست تھے اور ان کے چہرے پر ہر وقت مسکراہٹ کھیلتی۔ ہمیں چاہیے ہم انہیں اول ماڈل بنائیں۔ ڈاکٹر اجمل نیازی نے کہا کہ فوزیہ تبسم جو کہ حقیقت میں فوزیہ صوفی تبسم ہے اور آغا شاہد نے مل کر صوفی تبسم کو دوبارہ زندہ کر دیا ہے۔ ہم ان سے مل کر ان کے مشن کو آگے بڑھائیں گے۔ انہوں نے کہا کہ صوفی صاحب کی خدمات اس قدر زیادہ ہیں کہ ان کو ان اجتماعات میں پوری طرح بیان کرنا ممکن نہیں۔ گورنمنٹ کو چاہیے کہ ان کی خدمات کے اعتراف میں صوفی تبسم اکیڈمی کی سرپرستی کرے اور ان کی رہائش گاہ کو "یادگار صوفی تبسم" قرار دیا جائے اور وہاں ان کی تمام تر لائبریری اور زیر استعمال اشیاء کو آنے والے وقتوں کے لئے محفوظ کر دیا جائے۔ اس کے علاوہ الحمراء ہال -۲ کا نام صوفی تبسم ہال رکھ دیا جائے، جس کی تمام شرکاء نے پوری طرح تائید کی۔

چوتھی برسی کے موقع پر

جواں مرگ ولی الرحمٰن ناصر کی یاد میں

انور سدید

وقت کس تیز رفتاری سے گزر رہا ہے۔ میں چشم تصور سے ولی الرحمان ناصر کو دختر ''تخلیق'' کی ایک غیر رسمی محفل مشاعرہ میں شعر سناتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔ اس دن دوپہر کو میں نے اسے اپنے مطب میں مریضوں کی نبض شناسی کرتے ہوئے اور تیز بہدف نسخوں سے علاج تجویز کرتے ہوئے دیکھا۔ شام کو وہ اظہر جاوید کی ایک تقریب شیزان میں سجا رہا تھا۔ اس تقریب کی ''میزبانی'' اور اسٹیج سیکرٹری کا فریضہ وہ خود ادا کر رہا تھا۔ پھر اچانک خبر آئی کہ ولی الرحمان ناصر نے اس دنیا سے اپنا رخت سفر سمیٹ لیا ہے۔ یہ 9 فروری 2003ء کا دن تھا۔ اسی شام کو وہ زیر لحد چلا گیا۔ اس کے سب دوست رو رہے تھے کہ ایک یار دلنواز بھری محفل سے اچانک اٹھ گیا تھا۔

حکمت ولی الرحمان ناصر کا پیشہ تھا، شاعری اس کا عشق تھا، کسی خاتون مریض کی نبض دیکھ رہا ہوتا تو یوں محسوس ہوتا جیسے نسخہ تجویز کرنے کے لیے نیلی چھت والے سے رہنمائی حاصل کر رہا ہے۔ مریضہ رخصت ہو جاتی تو میز کی دراز سے ایک کاپی نکالتا اور اس پر کچھ لکھنے لگتا۔ میں سمجھتا شاید مریضہ کے کوائف مرض کی کیفیت اور تجویز کردہ نسخہ لکھ رہا ہے۔ ایک روز اس کی غیر حاضری میں یہ کاپی دیکھی تو میں حیرت زدہ رہ گیا۔ یہ ولی الرحمان کی بیاض تھی۔ واپس کمرے میں آیا تو میں نے پوچھا۔

''یہ کیا درفنطنی ہے؟

کہنے لگا کہ مجھ پر نسخہ اور شعر نبض دیکھنے کے دوران نازل ہوئے ہیں۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ روزانہ اشعار کہنے اور مشاعروں میں سنانے کے باوجود ولی الرحمان ناصر نے اپنا دیوان چھپوانے کی طرف توجہ نہیں دی۔ موت اسے اچانک اڑا کر لے گئی تو اس کی کتابیں چھاپنے کا خیال اس کے بھائی عبدالرحمان نصر کو آیا اور اس نے تھوڑے سے عرصے میں تین کتابیں ''احساس کی پرچھائیں'' ''خط کے نیچے نام نہ لکھنا'' اور ''اپنے دل سے تیرے

دل تک'' شائع کر دیں۔ ان کتابوں پر ملک کے بہت سے اخبارات و رسائل میں تبصرے شائع ہوئے اور ولی الرحمان ناصر کے ساتھ عبدالرحمان نصر کو بھی خراج تحسین ادا کیا گیا کہ اس نے اپنے بھائی کے کلام کو استبرِ و زمانہ ہونے سے بچا لیا تھا اور کتابوں میں محفوظ کر دیا تھا۔ ولی الرحمان ناصر کا حلقۂ احباب بہت وسیع تھا۔ یہ حلقہ ''خواتین ڈائجسٹ'' کے دفتر سے شروع ہوتا تو دوا خانہ حکیم اجمل خان کا موڑ کاٹ کر دخترِ تخلیق سے ہوتا ہوا شاہ نور سٹوڈیو سے بھی آگے نکل جاتا۔ اس کے حلقے میں ہر قسم کے لوگ شامل تھے۔ ملک کی نامور اداکارائیں اس سے خاص الخاص نسخے حاصل کرتیں۔ نو آموز شعراء غزلیں درست کرانے آتے تو ولی الرحمان ناصر انہیں نئی غزل تھما دیتا اور مربہ سیب کھانے کا مشورہ دیتا۔ آپ سے کیا پردہ میں بھی اس کا مستقل مریض تھا۔ میرے حافظے کو تیز کرنے کے لیے وہ مجھے خمیرہ گاؤزبان عنبری جواہر دار اور شہد کی بوتل ہر ماں کی کیم کو گھر پہنچاتا تھا۔ دراصل اس نے کہیں سے سن لیا تھا کہ ہمدرد دواخانے کے حکیم محمد سعید نے یہ نسخہ میرے لیے تجویز کیا تھا۔ وہ ادیبوں کا علاج مفت کرتے تھے۔ ان کی وفات کے بعد اس روایت کو حکیم راحت نسیم سوہدروی نے زندہ رکھا۔ ولی الرحمان ناصر کی روایت پر حکیم عبدالرحمان نصر عمل کر رہے ہیں۔ یہ طویل جملہ معترضہ لکھنے کے بعد اب یہ بتانا ضروری ہے کہ ولی الرحمان ناصر پر ان کے دوستوں نے اتنے مضامین لکھے کہ پوری ایک کتاب بن گئی جو ''ارمغان ناصر'' کے نام سے اس کے بھائی نے چھاپی ہے۔ اب یادوں کا سلسلہ شروع ہوا ہے تو ولی الرحمان ناصر کی یادیں گھٹائیں بن کر امنڈی چلی آ رہی ہیں۔ لیکن میں مزید کچھ لکھنے کی بجائے آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ اس جواں مرگ شاعر کے لیے جس کا نام ولی الرحمان ناصر تھا، دعائے مغفرت کیجئے۔ اللہ تعالیٰ اسے کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔

ڈاکٹر سعید اقبال سعدی

شریف کنجاہی، محسن بھوپالی اور ڈاکٹر انعام سعید کی یاد میں

میرا ایمان ہے کہ زندگی اور موت صرف خدا کے ہاتھ میں ہے۔ اس نے جتنی کسی کو مہلت دنیا میں دے کر بھیجا ہے وہ مدت پوری ہونے کے بعد اس کو دنیا سے واپس بلا لیا جاتا ہے۔ سب کو دنیا میں بھیجنے کا قدرت کا طریقہ ایک ہی ہے۔ مگر واپسی کے لیے موت کے کئی دروازے ہیں جن سے جانے والے واپس بلائے جا رہے ہیں۔ پچھلے چند مہینوں میں ادب کی دنیا سے بہت نامور ہستیاں اپنا کام پورا کر کے دنیا سے چلی گئیں اور ہمیں ان کے بعد ایک خلا سا محسوس ہونے لگا ہے۔ بہت سی ان ہستیوں پر میں اپنے تاثرات قلمبند کر چکا ہوں۔ آج کے میرے مضمون کا مقصد پہلے دو چار ہفتوں میں بچھڑنے والوں کو خراج عقیدت پیش کرنا ہے۔ ان میں سب سے پہلے پنجابی زبان کے ستون جناب شریف کنجاہی کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ جن سے میری پہلی ملاقات تعلقات عامہ کے دفتر میں ہوئی۔ جن میں مرحوم امیر عابد اور شریف کنجاہی ایک سرکاری ادبی کمیٹی کے ممبر منتخب ہوئے تھے۔ جس کا کام ادب کے دیوانوں کے حالات بہتر کرنے کا سوچنا تھا اور ان کی امداد کرنا تھا۔ مجھے فخر ہے کہ ہم نے چند لوگوں کی ان دنوں میں مالی امداد کی۔ مجھے اسی ملاقات میں شریف کنجاہی کی کھری اور سچی شخصیت نے متاثر کیا۔ انہوں نے پنجابی زبان سے اپنا عشق ظاہر کیا اور میں جو پنجابی کم لکھتا تھا۔ پنجابی میں بھی ٹھوکا ٹھاکی کرنے لگا۔ دو تین سال بعد ان سے ملاقات گوجرانوالہ بورڈ آف ایجوکیشن کے سالانہ مشاعرہ میں ہوئی جس کی صدارت جناب شریف کنجاہی نے کی اور میں اس کا کمپیئر تھا۔ مجھے اس تقریب میں جناب شریف کنجاہی کے ہاتھوں ادبی شیلڈ وصول کرنے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ مجھے اب پنجابی زبان میں شریف کنجاہی کی وفات سے ایک خلا سا محسوس ہو رہا ہے لیکن مجھے امید ہے کہ قدرت اس خلا کو خود ہی پر کرنے کا سبب پیدا کر دے گی۔

میرے دوسرے مہربان جو پچھلے دنوں اس دارفانی سے کوچ کر گئے وہ محسن بھوپالی تھے۔ جن سے میری خط و کتابت گزشتہ پندرہ بیس سالوں سے تھی۔ ان کی یہ خوبی تھی کہ خط کا جواب باقاعدگی سے مل جاتا تھا۔ وہ ہماری ادبی سرگرمیوں کی خبریں پڑھ کر بھی تبصرہ فرمادیا کرتے تھے۔ ڈھائی تین سال قبل میں کراچی گیا تو انہیں فون کیا۔ انہوں نے کہا فوراً ملنے چلے آؤ۔ میں نے ٹیکسی لی اور ان کی رہائش گاہ پر پہنچ گیا۔ ناظم آباد میں جاکر ان کا پوچھا تو یقین کریں اتنے بڑے شہر میں ان کا گھر ڈھونڈنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ ان سے دو گھنٹے کی ملاقات رہی۔ خوب باتیں ادھر ادھر کی ہوئیں۔ مجھے اس پر تعجب تھا کہ ان کی نظر پاکستان کے ہر شہر کے ادب پر تھی اور وہ بہت سے چھوٹے شہروں کے لوگوں کو بخوبی جانتے تھے۔ جو ان کے بڑے پن کی دلیل تھا ان کا لکھا ہوا آخری خط تقریباً تین ماہ قبل ملا تھا اور پھر ایک دن خبروں میں ان کی وفات کی خبر سن کر دل دھک سا ہو کر رہ گیا۔ خدا انہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے وہ ادبی دنیا میں مدتوں یاد رہیں گے۔

گوجرانوالہ حلقۂ اربابِ ذوق کے سابق سیکرٹری ڈاکٹر انعام سعید بھی کیا خوب آدمی تھے۔ ایک لکھا اور دنیائے ادب پر اپنی صلاحیتوں کا سکہ جمادیا۔ نثر میں ان کا قلم بہت خوبصورتی اور روانی سے تخیلات کو اپنی گرفت میں لاتا رہتا تھا۔ بہت سے افسانے ان کے مختلف ادبی رسائل اور جرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان کے ساتھ میری آشنائی تقریباً پندرہ سال سے تھی۔ وہ بہت مرنجان و مرنج اور پاک طینت آدمی تھے۔ کبھی کسی کی غیبت نہیں کی۔ ہمیشہ کام کام کرنے کو ترجیح دی۔ انہیں کینسر جیسے موذی مرض نے اس دنیائے فانی سے اپنے شکنجے میں لے لیا اور موت کی وادیوں میں لے گیا۔ انہوں نے اپنی زندگی کی آخری تحریر ''ادب دوست'' میں چھپنے کے لیے بھجوائی تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ان کی مجھ سے محبت کا ثبوت ہے۔ میری دعا ہے کہ خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت کی ہوائیں نصیب کرے۔ ان جیسا ادیب گوجرانوالہ کی فضاؤں میں کم کم ہی نظر آتا ہے۔

باؤ رمضان شاہد کئی کتابوں کے شاعر ہیں اور پاکستان کے کئی شہروں میں مشاعرے پڑھنے کا اعزاز حاصل کر چکے ہیں۔ پچھلے دنوں ان کے چھوٹے بھائی جو خوبصورت قلمکار اور دست کار تھے وہ بھی اپنی یادیں چھوڑ کر اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ وہ باؤ عبدالحمید کے نام سے معروف تھے اور تحریریں بھی اسی نام سے لکھتے تھے۔ ادارۂ ادب دوست کے اراکین باؤ عبدالحمید کی وفات پر باؤ رمضان شاہد کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔

گوجرانوالہ کی ادبی تقریب میں
ڈاکٹر سعید اقبال سعدی کے ہمراہ
میاں شان احمد، شریف کنجاہی (مرحوم)
انور مسعود، گلزار بخاری کا گروپ فوٹو

سید معراج جامی، محسن بھوپالی (مرحوم)
ڈاکٹر سعید اقبال سعدی

عبدالوکیل ملک، ڈاکٹر سعید اقبال سعدی
مقصود الٰہی شیخ
ڈاکٹر انعام سعید (مرحوم)

ڈاکٹر خیال امروہوی

شعلۂ گفتار

گذر گئے وہ زمانے کہ جن سے ہم گذرے
وہ راستے تھے عجب جن سے لوگ کم گذرے

قلم بھی جن کی وضاحت سے سخت عاجز ہے
وہ سانحے بھی ہمیں پر قدم قدم گذرے

حُسن اک آگ ہے چاہت کو بڑھا دیتا ہے
وصل صد کیف کے انداز سکھا دیتا ہے

ہم کہن سال سہی دل تو جواں رکھتے ہیں
شعلہ بجھتا ہے مگر گرم ہوا دیتا ہے

وقت کہتا ہے نئی جنگ کا آغاز کریں
گونگی صدیوں کے تقاضوں کو ہم آواز کریں

پست ہمت نئے رستے پہ نہیں چل سکتا
بھیگ جائے جو فتیلہ وہ نہیں جل سکتا

ماؤ کے نقش قدم پر ہمیں چلنا ہو گا
فقط جاگیر کا قانون بدلنا ہو گا

جام شب تاب سحر خیز ہے کچھ دیر چلے
اس سے پہلے کہ مکافات کا اندھیر چلے

چار لمحے تو مصیبت سے میسر ہو نجات
امن و آرام کا سکہ بھی تو کچھ دیر چلے

کیا کہیں کیا نہ کہیں لفظ کہاں ملتے ہیں
کھوج ہی کم ہو تو کب گنج گراں ملتے ہیں

یوں تو ہم سوچ کی اس حد سے پرے جا نکلے
روح تخلیق کے آثار جہاں ملتے ہیں

وہ تعفن ہے کہ محسوس ہوا دم نکلا
اپنی تاثیر میں ہر لحہ یہاں سم نکلا

نار دوزخ ہے مقدر میں تو مل جائیگی
زندگی میں تو ہر اک شہر جہنم نکلا

عمر بے رنگ عجب طور سے گزاری ہم نے
میلی پوشاک بدن سے نہ اتاری ہم نے

فکر کو بیچ کے کھائے نہ مرغن لقمے
زندگی جھوٹ سے ہرگز نہ سنواری ہم نے

ماحول کے معیار سے جینا نہیں آیا
ساغر تو کئی آئے تھے مینا نہیں آیا

ہر چند کمی آئی نہ میخانے میں لیکن
افسوس تو یہ ہے ہمیں پینا نہیں آیا

نذرِ ادب دوست

ادب دوست لفظوں کی مہکار ہے
عنادل کی گلشن میں چہکار ہے
صدا اس کی علم و ادب، روشنی
تجارت نہیں ہے یہ ایثار ہے

شوکت واسطی

چھوٹے بھائی مسرت میاں کی ناگہانی موت پر
(سانحہ کراچی کی موذی وبا "ڈینگی" کے سبب پیش آیا)

☆

مضبوط عمر بھر رہا، اب کیا ہوا ہوں میں
ہر اک محاذِ زیست سے پسپا ہوا ہوں میں

ہے یہ طویل زندگی زخموں سے چور چور
عبرت نشاں مزار شکستہ ہوا ہوں میں

فرحت علی کے بعد مسرت بھی چل بسا
دنیائے پُر ہجوم میں تنہا ہوا ہوں میں

قسام نے جو لوحِ مقدر پہ لکھ دیا
مت فال بین پڑھ اسے رویا ہوا ہوں میں

دنیا میں رہ کے کوئی کب دنیا سے کٹ سکا
خود میں سمٹ کے بھی وہی بکھرا ہوا ہوں میں

صدمہ نکل کے دل سے سرایت ہے ذات میں
رنج و الم کا ٹھوس سراپا ہوا ہوں میں

شوکت ہے آنسوؤں سے قلم بند مرثیہ
ماتم سرائے ذات کا کتبہ ہوا ہوں میں

روبینہ پروین

آنسو

☆

میرے آنسو
میری پلکوں کے پیچھے
چھپ گئے ہیں
میں اپنے آنسوؤں سے
کہہ رہی تھی
میرے غم خوار ہو تم
میرے ہمراز ہو تم
میں ہنس ہنس کر
بکھرتی جا رہی ہوں
میں ڈرتی ہوں
کہ اس جھوٹی ہنسی میں
کہیں خود کو
نہ ایک دن بھول جاؤں
میری پلکوں کے آنگن سے
میرا سچ
بن کہ آ جاؤ
مجھے پھر سے رُلاؤ
مجھے پھر سے بتاؤ
کہ میں اب تک
جی رہی ہوں

جاوید منظر

نذرِ امیر خسرو

شبانِ ہجراں سے زلفِ پیکاں کی ہو رہی ہیں عجب بتیاں
یہ دل گرفتہ، یہ جاں کشیدہ دکھا رہی ہیں اُداس اکھیاں

جو عہدِ رفتہ سے پوچھنا ہو، امیر خسرو سے پوچھ آؤ
کہاں گئے صد ہزار رہبر، کہاں گئیں وہ دُلاری سکھیاں

جدائی کا کوئی تو سبب ہو، ہمارے جینے کا کوئی ڈھب ہو
زمانہ دیکھو تو کس طرح سے اڑاتا جاتا ہے ہم پہ ہسیاں

وہ جن کے پہلوؤں میں رہتے رہتے، حسین لمحے گزر ابیٹھے
کہاں رہیں وہ ہماری شامیں، کہاں گئیں وہ ہماری رتیاں

ہمارا ہر لمحہ اک اجل ہے، غموں میں ڈوبا ہر ایک پل ہے
جدائی کی یہ ہزار رتیاں، نجانے اکھیوں میں کیسے کٹیاں

گئی جوانی کے سارے لمحے ہماری آنکھوں میں بس چکے ہیں
سو آج دوہری کمر کو لے کر، نہ آپ آئیں، نہ بھیجی پتیاں

اُداس منظر یہ پوچھتا ہے، تجھے ان اشکوں سے کیا ملا ہے
کہ جن کو ہر پل بہا بہا کر، اُجاڑ کر لیں ہیں اپنی اکھیاں

انور سدید

زندگی کے رستے میں

☆

زندگی کے رستے میں
تو ہمیں جو مل جاتا
آرزو نکھر جاتی
پھول دل کا کھل جاتا

جس قدر زمانے نے
دھول ہم پہ ڈالی ہے
دھول ساری اڑ جاتی
بوجھ سب اتر جاتا
اس طرف کو چل پڑتے
جس طرف کو تو چلتا
لطفِ زندگی ملتا
آرزو نکھر جاتی
پھول دل کا کھل جاتا

زندگی کے رستے میں
تو نہیں ملا ہم کو
اب یہ حال ہے جیسے
چارسُو اندھیرا ہے
اور اس اندھیرے میں
وحشتوں کا ڈیرہ ہے

رب نواز مائل

آسماں

جیسا بھی ہے وسیلہ کوئی
روشنی کے منابع بھی
اس سے ہیں
جن سے چلتا ہے نظمِ جہاں
کاروبارِ زمانہ بھی سب
اور پھر دید کے
بھی تو کیا سلسلے
حُسن جن کے بغیر اس طرح
ہی لگے
ہے کہاں یا اُسے
کس نے دیکھا پتا

وہ طلب

وہ طلب
جو سووٗں معنوں میں
اک محبت کی تھی
حد سے بڑھ کر ہی پیداسی بھی
حد سے بڑھ کر ہی دستاسی بھی
اس صدی سے ذرا پہلے تک
جانے اب ہے کہاں؟
کیا اُسے یہ مشینیں ہی ہیں کھا گئیں؟

فرزانہ خان نیناں (نوٹنگھم)

فکریں

پڑی ہوئی تھی روکھی پھیکی
کوری کوری چکنی چپکی
کچے پکے خوابوں سے کچھ تو تو میں میں ہوتی تھی
کبھی کبھی کچھ نکتہ چینی تاروں سے کر لیتی تھی
چاند سے آنکھ مچولی کرتے رات بھی کٹ ہی جا
ذہن میں سوچوں کا اک سورج لمحہ لمحہ جلتا تھا
کتنی آنچ بڑھانی تھی اور کتنی کم کر دینی تھی
لہراتی اس تیز ہوا کے ساتھ کہاں تک جانا تھا
بارش کی نیلی بوندوں کے سُر میں کیسے بہنا تھا
آنکھیں کتنی بھرنی تھیں اور کتنی خالی رکھنی تھیں
میں یہ ساری فکریں......
تیری ذات میں چھپ کر بھول گئی......!!!

اک کھلونے سے ہیں

ہم جو دیکھا کئے
خواب کتنے وہ یوں
کچھ بھلے ہونے کے کچھ برے ہونے کے
بے خبر جیسے تھے اس سے ہی
سو طرح
ہم تو بے بس سے ہیں
اک کھلونے سے ہیں
دستِ تقدیر میں
اپنے ہر
ناتے ہی

بے اثر کیوں ہوں؟

وہ سارے گیت اپنے بے اثر کیوں ہوں
جو اک عمرِ جواں کی دین سے تھے تب
قلم بس جن کے لکھنے کو تھا جوں اپنا
وہ سارے گیت اپنے بے اثر کیوں ہوں
کہ جن میں تھی مری ہر بات بھی تو یوں
مثالی سا کبھی میں نے لیا رُخ کو
مثالی سا کبھی میں نے لیا لب کو
وہ سارے گیت اپنے بے اثر کیوں ہوں
کہ چاہے ہوں یہ اب حالات کتنے اور
کہ چاہے ہو زمانہ کتنا بدلا بھی
کہاں اس زیست کا آنگن تہی ہو گا
لب و رُخ کی ثنا کے سبز گیتوں سے

جاوید صدیق بھٹی

شام ہوگئی ہے

یادوں کے سرد لمحے
مانوس ہو رہے ہیں
خاموش رہگزر پر
جگنو بھی سو رہے ہیں
سردی کے موسموں سے
وادی سلگ رہی ہے
جھرنوں کے دل کی دنیا
خاموش ہوگئی ہے
برہا کی تیز آندھی
برفوں کا تیز طوفاں
راہی ہے جنگلوں میں
اور شام ہوگئی ہے

نیاز احمد صوفی

ماہیے

منہ موڑ گیا ماہی
رشتہ محبت کا
کیوں توڑ گیا ماہی

☆

اڑتی ہے پتنگ ماہی
ڈور نہ کٹ جائے
منہ زور امنگ ماہی

☆

ترامیل عذاب ہوا
دیر سے گھر پہنچے
پل پل کا حساب ہوا

☆

ساون کے مہینے میں
کون گرہ کھولے
پڑ گئی جو سینے میں

☆

آموں کی بہاروں میں
نہر کنارا ہو
ہم بیٹھے ہوں یاروں میں

جب ریل گزرتی ہے
شور کرے پٹڑی
کیوں کانپتی دھرتی ہے

☆

دو قطرے پانی کے
ساتھ ہوا لائی
ایام جوانی کے

☆

اف کون وہ لڑکا ہے
کھڑکی کھولی ہے
دل زور سے دھڑکا ہے

☆

یوں اس کو ستائیں گے
ہجر کے چُن چُن کر
ہم شعر سنائیں گے

☆

آنکھوں کے اجالے ہیں
دیکھ مرے گبھرو
کن ماؤں کے پالے ہیں

اکمل شاکر

ماہیے

پنجاب کی ناری ہو
جسم ہے انگوری
صورت کی اناری ہو

☆

مت کال ہی کر ساجن
اتنا بھی نہ تڑپا
اللہ سے ڈر ساجن

☆

دن رات میں ڈھلتی ہے
جہلم کی رُت بھی
پل پل میں بدلتی ہے

☆

جہلم میں ملو ساجن
پنڈی سے آگے
کچھ ساتھ چلو ساجن

☆

فنکار کا فن ہوں میں
پنجاب کی ٹو ماہیا
پسنی کا بجن ہوں میں

دوہے

دیس پردیس

☆

برکھا ہو پردیس میں بالک پن یاد آئے
سوندھی ماٹی دیس کی سپنوں کو مہکائے

تُو گوروں کے دیس میں ڈھونڈ رہا ہے چھاؤں
تیرا رستا دیکھتا برگد تیرے گاؤں

پردیسی بھی سوچتا کاہے وہ لوٹ آئے
پنچھی اپنے دیس کے اڑ گئے دیس پرائے

میں وہ پُروا دوستو اپنی پریت نبھائے
کبھی پدھاریں گاؤں سے بگیا چھوڑ نا جائے

سو جا کر پردیس میں بھیا ہو آباد
ممتا اپنے دیس کی سدا رہے گی یاد

پنچھی نگری

☆

طوطا، مینا، کاگا، چڑیا، چکوا، کوئل، باز
پریت نگر کے پنکھ بکھیرو گائیں اک آواز
توتا توتی سے یہ پوچھے کیوں روٹھی ہے نار
دیکھ تو چکوا چکوی بیٹھے نیناں ڈولے پیار
پار نگر سے نیا کھیتا آیا میرا میت
من ساگر پر کونجیں اتریں دیا لے کر پریت
کاگا تاگا لے کر بھاگا گوری شور مچائے
سوئی کومل ہات ہے اتری لوہو بہتا جائے
من بگیا میں پڑ گئے جھولے ساجن تان لگائے
کوئل کالی کرماں والی امبوا بیٹھی گائے
کاگا دیکھے، ساجن دیکھے گوری چھاج ہلائے
دونوں اپنی دھن کے پکے بیٹھے گھات لگائے
جنگل جنگل کوئل کُوکے من بگیا خاموش
ساون کی رُت آئی طاہر مالی ہے مدہوش
وہ ہے چاند، چکوری تُو ہے، کس سے آس لگائے
ساجن تیرا چھلیا راجا، تیرے ہات نا آئے
من بگیا میں خوشبو تیری، تن تیری مہکار
پون جھکورا پنچھی بن کر اترا میرے دوار

خاور اعجاز

نمکین قطعات

دھیرے دھیرے شوق کا منظر کُھلا
منہ کُھلا، آنکھیں کُھلیں پھر سر کُھلا
شعر تو تقریب ہی میں کُھل گئے
صاحبِ اشعار چائے پر کُھلا

☆

اب تو برسوں کے شناسا بھی بلائے پہ ملیں
جیسے تقریب میں دو اجنبی چائے پہ ملیں
یہی اندازِ وفا ہے تو وہ دن دور نہیں
جب مکانوں کی طرح دوست کرائے پہ ملیں

☆

جس کو چھپا رہے تھے وہی بات کُھل گئی
ہم کیا کُھلے کہ حیثیتِ ذات کُھل گئی
پسماندگی تو کپڑوں کی جدت نے ڈھانپ لی
دورانِ گفتگو مگر اوقات کُھل گئی

☆

نئی اُفتاد سر پر آ پڑی ہے
پرانی کھاد سر پر آ پڑی ہے
کیے جاؤ سیاسی نعرہ بازی
یہ زندہ باد سر پر آ پڑی ہے

ہے اک فرق نزاکت کا
لہجے اور رویے میں
جیسے حدِ فاصل ہے
شاعر اور گویے میں

☆

پلتی رہی ہے سایۂ گُل اختیار میں
نکلی ہوئی ہے ان دنوں کچھ اختیار سے
بازار میں ہے گھاس کا کھمبا لگا ہوا
اور بھینس ہے بندھی ہوئی بجلی کے تار سے

☆

کچہریاں ہی مری ہیں نہ کوئی تھانہ مرا
ہوائے دہر میں اڑتا کہاں بھکانہ مرا
تمہارے شہر کا پانی مجھے نہ راس آیا
رہا خراب ہمیشہ یہاں مثانہ مرا

☆

چار اور چار آٹھ ہوتے ہیں
تیس اور تیس ساٹھ ہوتے ہیں
ساٹھ کی عمر آئی تو دیکھا
آگے پھر کاٹھ باٹھ ہوتے ہیں

منی افسانے

''آئیڈیا''

ڈاکٹر عمران مشتاق

برطانیہ میں کوئی شے ارزاں نہیں۔ مکان ہیں تو قیمتیں آسمان سے باتیں کر رہی ہیں۔ کاریں تو یورپ بھر میں سب سے مہنگی ٹیکسز کی بھرمار فیول کی قیمت دنیا بھر میں سب سے زیادہ ٹرین کے ٹکٹ بعض حالات میں ہوائی سفر سے بھی مہنگے۔ کالج یونیورسٹی کی تعلیم ماں باپ کی کمر توڑتی ہے یا پھر اسٹوڈنٹ کو لون کے نیچے دبا دیتی ہے۔ کرسٹی جب پہلی بار اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ ماں کے ہاں اٹھ آئی تو ماں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ بیٹی کی کم نصیبی کا ماتم بھی کیا کہ اس کے فلیٹ میں چوری ہوگئی ہے۔ اب ڈر کے مارے اس گھر میں رہنا نہیں چاہتی۔ ساتھ میں تسلی بھی دی۔ جب دوسری بار چوری ہوئی تو کرسٹی کو اپنے فلیٹ میں گئے ہوئے صرف سات ہفتے ہوئے تھے اور وہ ماں کے گھر پورے پانچ ماہ رہ کر گئی تھی۔ اس بار ماں نے خوش آمدید تو کہا مگر تشویش کا اظہار بھی کیا اور بڑی کوشش کے بعد تین مہینوں کے بعد انہیں چلتا کیا۔ جب چوری کا واقعہ تیسری بار دہرایا گیا تو کرسٹی کا پورا فلیٹ چور خالی کر گئے تھے صرف فرنیچر باقی رہ گیا تھا۔ ماں نے ہمدردی کی بجائے سرد مہری دکھلائی اور رویہ ایسا رکھا کہ مہینے کے بعد کرسٹی نے اپنے بوائے فرینڈ ولیم سے اپنے فلیٹ واپس چلنے کو کہا۔ مزید دو ہفتوں کے بعد بالآخر وہ تیار ہوگیا۔ ماں نے چلتے چلتے کہا کہ اب آئندہ جب بھی آنا ہو تو ایک تو اکیلے آؤ اور وہ بھی فون کیے بغیر ہرگز نہیں۔ ملنے کی حد تک تو ٹھیک ہے مگر رہائش کے لیے بالکل بھی نہیں۔ کیونکہ اس کے خرچے اور بلز بہت بڑھ جاتے ہیں۔ کرسٹی کو ماں کے روکھے پھیکے بیزار کن رویے پر بہت غصہ آیا اور اپنے فلیٹ پر پہنچتے ہی اس نے ولیم کی خوب خبر لی۔ یہ اس کا ہی آئیڈیا تھا کہ سامان چھپا کر چوری کا ڈرامہ کیا جائے اور یوں کچھ عرصے کے لیے ''ساس'' کے ہاں پناہ گزین ہو کر خرچے بچائے جائیں تاکہ کچھ قرضے ادا ہو سکیں۔ ولیم اب یہ آئیڈیا اپنے والدین کے ساتھ آزمانے کا سوچ رہا تھا جو اسکاٹ لینڈ میں رہتے تھے۔

(۲) ''تیسرا بیٹا''

بڑا بیٹا بلدیہ میں انجینئر تھا۔ منجھلا اکاؤنٹنسی کا امتحان پاس کر کے سعودی عرب سدھارا تھا جبکہ چھوٹا بیٹا بی اے میں تین بار فیل ہونے کے بعد جاب ڈھونڈ رہا تھا۔ پاس رہنے کی بدولت اور نکمے پن کے کارن ہمیشہ زیرِ عتاب رہتا۔ اٹھتے بیٹھتے بے بھاؤ کی پڑتیں۔ انہیں اس بات پر بڑا ہی فخر و غرور تھا کہ جتنا مرضی برا بھلا کہہ لو مجال ہے جو آگے سے آنکھ اٹھا کر ایک لفظ ہی کہہ جائے۔ خود ساری زندگی ہیڈ کلرکی اور شاعری کی تھی۔ شاعری کی وجہ سے محکمہ ڈاک بھی گڈ بک میں نہیں تھا۔ ان کے ادبی رسائل اور کتابیں اکثر راستے میں ہی اڑن چھو ہو جاتی تھیں۔ جب ڈاک کے نظام کو گالیاں پڑتیں تو چھوٹا سپوت بھی خوامخواہ

ہی لپیٹ میں آجاتا۔ اب کچھ عرصے سے وہ محکمہ ڈاک کی مجموعی کارکردگی سے بہت خوش تھے۔ کتابیں اور رسائل باقاعدگی سے مل رہے تھے۔ بلکہ کچھ ایسے رسائل بھی ان تک پہنچنے لگے تھے جن کے ساتھ انہوں نے کبھی بھی خط و کتابت نہیں کی تھی۔ زندگی میں پہلی بار ان کے اندر کے شاعر نے سکون کی سانس لی تھی۔ چھوٹے بیٹے نے اب تک انہیں یہ نہیں بتایا تھا کہ اسے پوسٹ مین کی نوکری مل گئی ہے۔

(۱) ''نمبر پلیٹ''

''ہوں! تو یہ پاکستانی علاقہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ میں نے غلط کہا مجھے کہنا چاہیے تھا کہ اس علاقے میں مسلمان بستے ہیں۔''

''تم نے مسجد دیکھ کر اندازہ کر لیا ہوگا۔''

''نہیں۔ ضروری تو نہیں کہ جہاں مسجد ہو وہاں آس پاس مسلمان ہی بستے ہوں۔ خصوصاً برطانیہ جیسے ملک میں۔''

''تو پھر تم نے کیسے پتہ چلا لیا کہ یہ مسلمانوں کا علاقہ ہے؟''

''یہ تنگ سڑکیں، بازو سے بازو ملائے کھڑے چھوٹے چھوٹے مکانات جنہیں آپ لوگ غالباً ٹیرس ہاؤسز کے نام سے یاد کرتے ہیں۔''

''ٹیرس ہاؤسز تو اس ملک میں عام ہیں یہ اس بات کی نشاندہی نہیں کرتے کہ یہ صرف مسلمانوں کی ملکیت ہیں۔''

''ہر طرف گندگی، صفائی ستھرائی کا کوئی معقول انتظام نہیں اور سب سے بڑھ کر کسی کو کوئی خاص فکر بھی نہیں۔''

''اگر اس پیمانے پر جانچو گے تو صرف مسلمانوں کو دوش دینا مناسب نہیں ہوگا۔ تارکین وطن کی دوسری کمیونٹیز بھی کم و بیش یہی صورت حال ہے۔''

دیکھیے برا مت مانیئے گا مسلمانوں کا اور خصوصاً پاکستانیوں کا ذہن اور عادات اتنی آسانی سے تبدیل نہیں ہوتیں۔ ہر طرف مرسیڈیز اور بی ایم ڈبلیو (BMW) کے نئے پرانے ماڈل نظر آرہے ہیں۔ کئی کی نمبر پلیٹیں انہیں ٹیکسی ظاہر کر رہی ہیں۔ آپ بھی تو مجھے مرسیڈیز ہی میں لے کر آئے ہیں اور نمبر پلیٹ تو......

(۲) ''سرکاری تعطیلات''

پاکستان سے چلتے ہوئے نہ جانے کیسے کیسے سنہری خواب آنکھوں میں لہرا رہے تھے۔ حقیقت میں انگلستان خوابوں سے دور ایک ایسا ملک تھا کہ ''خوابوں کی تعبیر الٹی ہوتی ہے'' کا مقولہ سمجھ میں آتا تھا۔ سردی ایسی کہ منہ میں اگر مصنوعی بتیسوں تو شاید آپ ہی باہر نکل پڑے۔ یہاں اسے موسم اور گرگٹ میں گہری دوستی نظر آئی۔ لمحوں میں جل تھل مچانے والی بارش اور پل بھر میں مطلع صاف۔ انگریزوں کی روایتی سرد مہری کا تجربہ بھی ہوا۔ جسے وہ متانت اور بردباری سے تعبیر کرتے۔ یوں تو

خوابوں کو چور چور کرنے والے کئی عوامل تھے۔ مگر ایک بات اسے خصوصاً مشکل محسوس ہوئی اور وہ سرکاری تعطیلات سے متعلق تھی۔ یہاں پر انہیں بنک ہالیڈے کہا جاتا تھا اور انگلینڈ میں سال بھر میں ان کی تعداد صرف 8 تھی۔ ''یہ تو کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔'' وہاں پہ اقبال ڈے کی چھٹی، قائداعظم ڈے پر عام تعطیل، یوم پیدائش پہ بھی چھٹی اور برسی پہ بھی اسی عمل کا دہراؤ۔ 23 مارچ پاکستان ڈے، 14 اگست یوم آزادی، 6 ستمبر جنگ جیتنے کی خوشی میں ایک اور آرام کا دن۔ میٹھی عید پر تین دن اور بقر عید پر پھر تین دن ملک بھر میں تعطیل۔ کشمیر سے یکجہتی کے لیے ایک دن تمام کاروبارِ حیات معطل۔ لیاقت علی خان کی شہادت پر عوام کا عقیدت سے چھٹی منانا اور بھی کئی تعطیلات اور اب سنا تھا کہ حکومت چند مزید دن سرکاری چھٹی کا سوچ رہی تھی۔ ''مگر مجھے کیا فائدہ میں تو اب یہاں آچکا ہوں۔ اب یہ سب سوچنے یا دہرانے سے مطلب؟''

بہت سوچنے کے بعد اس نے گلاسکو میں آباد ہونے کا فیصلہ کیا کیونکہ اسکاٹ لینڈ میں بنک ہالیڈے کی تعداد دس تھی۔

کائنات کے راز

پہلی ہی ملاقات میں کھل جانا مجھے ہمیشہ سے عجیب لگتا ہے لیکن شاید انہیں نہیں لگتا تھا۔ اس لیے کھلے اور کچھ اس طرح کہ پیاز کی پرتیں بھی پناہ مانگنے لگیں۔ ان کی ساری باتیں کائنات سے متعلق تھیں۔ کائنات ایسی ہے، کائنات ویسی ہے۔ کائنات میں یوں ہوتا ہے کائنات میں ووں ہوتا ہے۔ کائنات رازوں سے بھری پڑی ہے۔ میرے چہرے کے بدلتے رنگوں کے کارن انہوں نے ذرا توقف کیا اور اچانک بھیدوں بھری نظروں سے تکتے ہوئے پوچھا ''کائنات میں اکائی کے فلسفے سے تو آپ واقف ہوں گے؟'' میں نے دانستاً چہرے پر بے زاری کے جذبات طاری کرنے چاہے۔ مگر میری ازلی مروّت نے میری ایک نہ چلنے دی۔ خود ہی بتانے لگے ''گو کہ یہ فلسفہ بہت ہی پرانا ہے مگر آپ کو نہایت ہی آسان الفاظ میں یوں سمجھاؤں گا کہ آپ اس موضوع پر کالج میں لیکچر دے کر ہر دلعزیز ہو جائیں گے۔'' اور میں زور و شور سے اس بد بخت کا نام سوچنے لگا۔ جس نے انہیں یہ بتایا تھا کہ میں کالج میں اپنے طلباء میں بطور لیکچرار زیادہ مقبول نہ تھا۔ وہ پڑھنا نہ چاہتے تھے اور میں زبردستی کرنا بہت ہی برا سمجھتا ہوں۔ ویسے میں حیران ہوتا ہوں کہ میرے اس رویے کی وجہ سے تو میرا مقبولیت کا گراف اونچا ہونا چاہیے تھا۔ جبکہ میرا سفر تو Down the hill تھا۔ وہ کھنکھارے تا کہ میں خیالات کی دنیا سے واپس کائنات میں آجاؤں۔ پھر جو اپنے فلسفے پر وہ شروع ہوئے ہیں تو میں نے کائنات کے بارے میں وہ وہ باتیں سنیں کہ میرے رونگھٹے کھڑے ہو گئے۔ زبردستی کرنا اور زبردستی سنانا کیا ہوتا ہے یہ میں نے اس دن جانا اور مزے کی بات یہ تھی کہ وہ شاعر بھی نہ تھے۔ میرے ذہن میں ایک جملہ بار بار گونج رہا تھا اور وہ تھا ''اے بس کر...... اے بس کر......'' میری بس ہو گئی۔ بناء سگریٹ پیے کانوں اور ناک سے دھواں سا نکلتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ اس سے پہلے کہ میں صبر کے دامن سے ہاتھ چھڑا کر اس کے ایسے ویسے استعمال کا سوچتا انہیں اچانک کوئی کام یاد آ گیا۔ جاتے جاتے میرے حوالے اپنا رسالہ ''کائنات'' کر گئے جس کے وہ ایڈیٹر تھے اور کائنات کے فلسفے پر ان کا تازہ مضمون اس میں شامل تھا۔ اس شام بہت دنوں کے بعد میں نے اپنی ڈسٹ بن سے کائنات کے راز شیئر کیے۔

(انشائیہ)

ٹیکس

محمد زبیر ٹیپو

ٹیکس وصول اور ٹیکس چوری کرنے والوں کی دلچسپی اور عدم دلچسپی سے اللہ تعالیٰ بچائے تو انسان بچتا ہے۔ ورنہ مشکل ہے۔ ہمارے ہاں لوگ ٹیکس دینے والے بھی تنگ اور لینے والے خوش نصیب جانے جاتے ہیں۔ پھر یہاں ٹیکس دینے کا خاطر خواہ کوئی اصول نہیں نہ وصول کرنے کا کوئی طریقہ ہے۔ شاہی والی بات ہے۔ جس کے گلے کو پھندے نے قابو کر لیا۔ پھانسی اس کا مقدر بن گئی۔

اف انشائیہ لکھنا تھا ٹیکسی پر تو ٹیکس نے اتنا خوف زدہ کر دیا ہے کہ اپنے مکان کو ٹیکسی جان کر ٹیکس دیتا ہوں۔ مکان نا ہوا چار پہیوں کی ٹیکسی ہو گئی۔ یہ شکر ہے کہ حکومت ہمارے گھریلو معاملات اور بولنے چلنے پھرنے پر ٹیکس نہیں لگاتی۔ نہ ہی سانس لینے پر نہ ہماری گھریلو کارکردگی کی اے سی آر بیوی سے لکھوائی ہے۔ صرف چار دیواری پر ٹیکس لگایا جاتا ہے۔ ٹیکس گھر کا دینے کے صلے سے پہلے ہی گورنمنٹ گلی میں گٹروں کی، بجلی کی لائنز، گیس کی لائنوں، پانی کی سپلائی کی لائنوں کی مد میں علیحدہ بھاری ٹیکس وصول کیا جاتا ہے۔ گھر ہمارا نقشہ حکومت کی مرضی کا۔ اس کو پاس کروانے کا علیحدہ خرچ پھر بھی ہر مہینے بل علیحدہ علیحدہ وصول کئے جاتے ہیں۔ اتنے زیادہ ٹیکسوں کی ادائیگی کے باوجود چوروں سے ہمارے گھر محفوظ نہیں، گلی محفوظ نہیں، معاشرہ محفوظ نہیں، ملک محفوظ نہیں۔

بہر حال بات کرنی تھی ٹیکسی کی تو جناب آج کی جدید ٹیکسی میں اور گھر میں کوئی خاص فرق نہیں۔ دونوں کے کرائے اور خریدنے میں کوئی خاص فرق نہیں۔ دونوں کے خریدنے میں برابر فراڈ کا اندیشہ دل کو بے چین رکھتا ہے۔ پھر دونوں کے چلانے میں بھی کوئی خاص فرق نہیں۔ دونوں کو بڑی مہارت سے چلانے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ دونوں جگہ ڈرائیور کی مرضی نہیں چلتی۔ پیچھے بیٹھی ہوئی سواری کو اس کی بتائی ہوئی منزل مقصود پر لے جانا لازمی ہوتا ہے۔ راستہ خود ڈرائیور کو تلاش

کرنا پڑتا ہے۔ سواری کو صرف منزل مقصود کا نام اور بعض دفعہ پتہ بتانا ہوتا ہے۔ دونوں کو چلانے کے لیے بھائی روپے کی اشد ضرورت پڑتی ہے۔ اس کے بغیر یہ دونوں گاڑیاں نہیں چلتیں۔ گھروں کے ٹائر اور انجن وہاں پر رہنے والے بیٹے اور بیٹیاں ہوتے ہیں اور نشست کا کام بیگمات کا ہے۔ گاڑی درست سمت چلانا' ہینڈل کو کنٹرول کرنا بیگم کی ذمہ داری میں شامل ہوتا ہے۔ ہلکے ہلکے دھکوں اور کھڈوں پر اف کی آواز اور سپیڈ زیادہ اور کم کرنے کا حکم ساتھ والی پچھلی سواری پر منحصر ہے۔

یہاں ڈرائیور کا کام گھر اور گاڑی کی الاٹمنٹ پر نظر رکھنے کا ہے۔ گاڑی اور گھر کی دیکھ بھال کرنے کا ہنر خود ڈرائیور کی ذمہ داری ہے، سواریوں کی نہیں۔ کیونکہ حادثہ ہونے کی شکل میں جواب ڈرائیور سے طلب کیا جاتا ہے۔ جتنا اچھا ڈرائیور ہو گا۔ وہ استاد اور گاڑی مرمت کرنے والے سے اتنا ہی اچھا کام لے سکے گا۔ ڈرائیور کو جب تک یہ نہ معلوم ہو کہ نقص کہاں ہے' فلاں آواز کہاں سے آرہی ہے' کون سی چیز کس سے ٹکرا رہا ہے' کون سا راستہ شارٹ کٹ ہے' یہ نہ ہو کہ سواری منزل مقصود کے اردگرد ہی گھومتی رہے اور سی این جی ختم ہو جائے۔ اس میں نقصان سواریوں کا ہے ڈرائیور کا بہت کم۔

ہماری خوش نصیبی ہے کہ ہم صاحب شعور ہوتے اور ترقی یافتہ ہوتے ہوتے رہ گئے ہیں۔ اس میں ساری ذمہ داری ہماری تھی کہ ملک کا پہلا بڑا نظام چلانے کے لیے غلط ڈرائیور کا انتخاب کیا۔ اصل میں یہ معاملہ بڑا اہم اور حساس ہوتا ہے۔ غور طلب ہے۔ مثلاً مجھے تجربہ ہوا ہے جڑواں شہروں میں رہنے کا۔ اگر آپ کو ضرورت پڑے کہیں جانے کی تو آپ کو دوسرے شہر کی ٹیکسی مل جائے وہ جس شہر میں سے آئی ہے وہاں رہنا اس کی دلچسپی میں شامل نہیں وہ لازمی طور پر زیادہ کرایہ وصول کرے گی۔

ایک بات بڑی اہم ہے کہ جب مشورے کے لیے کوئی نہ ملے تو سامنے دیوار سے کر لینا چاہیے تو جناب میری قوم کو کم از کم اپنے اہل شعور طبقے سے مشورہ لے لینا چاہیے تھا۔ یا ان ادبی علماء سے لے لینا چاہیے تھا۔ جو ساری عمر عوام کے مسائل اور دیگر معاملات کا رونا روتے رہتے ہیں۔ تاکہ آج ہمارا ادب کچھ اور ہوتا۔ لوگوں کی سوچ کچھ اور ہوتی۔ جتنی بڑی منزل ہو گی قربانی بھی اتنی بڑی دینی پڑے گی۔ اسی لیے اہل یورپ ترقی یافتہ نہیں ہو گئے ان کے پچھلے تین سو سال کی شعوری محنت ہے۔ اس لیے ان کا معمولی سا لکھاری بھی ترقی یافتہ ممالک کے اعلیٰ لکھاری سے بہتر مانا جاتا ہے۔

یہ مادی یعنی لوہے سے بنی ہوئی ٹیکسی تو کچھ عرصے بعد بے کار ہو جاتی ہے۔ گھر کی چار دیواری کو بھی مسلسل دیکھ بھال کی ضرورت پڑتی ہے۔ جسمانی ٹیکسی یعنی جسم اور شعور جوں جوں تعلیم و تربیت حاصل کرتے جاتے ہیں۔ اعلیٰ سے اعلیٰ تر ہوتے جاتے ہیں۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں اس کا برا حال ہے۔ وہ اس طرح کہ آپ پھول لگانے کے لیے قلم کی تلاش کرتے ہیں۔ پھر زمین کی کھدائی کی جاتی ہے' قلم لگائی جاتی ہے۔ اس کی چار پانچ مہینے خوب دیکھ بھال کی جاتی ہے۔ پھر جا

کر پھول کھلتے ہیں۔ انسانی آنکھوں میں کائنات ایک نیا حسن اختیار کرتی ہے۔ بالکل ایسے ہی فضاؤں میں نغمے بکھیرتی تتلیاں پھولوں پر اپنی جان نچھاور کرتی ہیں' شہد کی مکھی وہاں سے رس لیتی ہے یہ سب کچھ ایسے ہی نہیں ہو جاتا۔

اب جو شعور ٹیکسی کی شکل میں پیدا ہوتا ہے۔ یعنی انسان کا بچہ ہو تو اس کو کچھ عرصے تک لاڈ پیار کیا جاتا ہے جونہی بڑا ہوا چار سال کا تو اس پر پولیس کا تشدد نازل ہوتا ہے۔ یہ الف سے ے سکھانے کے معاملے میں سارا گھر تھانہ اور کچہری کا منظر پیش کر رہا ہوتا ہے۔ جہاں ہر وقت مجرموں کی چیخ وپکار کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ ماں اور باپ جو کچھ عرصہ پہلے بچے کے تحفظ کے ذمہ دار تھے۔ ان ہی کے ہاتھوں اس کا تحفظ برباد کیا جاتا ہے۔ اتنی مار پٹائی کی جاتی ہے۔ جیسے بچے کو اعلیٰ انسان نہیں بننا بلکہ اس کو ایک بڑا چور بننا ہے۔ جو چوری کرے تو مانے نہیں۔ ایسے ہی میرے ملک میں ہر چور کہتا ہے۔ ننانوے فیصد چور بازیری ہے اور میں اکیلا درست ہوں۔ ایسے ہی میرے ملک میں لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم نہیں ہوا۔ ہم گھر سے سکول تک بچے کے ساتھ جو مہربانی سے پیش آتے ہیں سب کو معلوم ہے۔ وہی کچھ میں اور آپ کر رہے ہیں اور پھر وہ بڑا ہو کر پوری قوم پر اپنی خدمات نچھاور کر رہا ہوتا ہے سب کو معلوم ہے۔

خدایا اس نظام میں بہتری کی بہت گنجائش ہے۔ طالب علموں پر اور ان لوگوں کو ان بچوں پر اور اس نصاب کا بوجھ نہ ڈالیں۔ جو بہت عظیم سوچ کا محور ہے۔ یہی بچے بڑے ہو کر ایسے پروفیسر بنتے ہیں۔ جنہوں نے کبھی کلاس کو پڑھانے کی ذمہ داری اپنے اوپر نہیں لی۔ ان میں سے بعض اخباری کالجوں اور ٹیلی ویژن کے پروگراموں میں قوم پر سخت تنقید کرتے ہیں۔

یونیورسٹی سے فارغ ہونے والے طالب علموں سے دو سال کا ہوس جاب لیا جائے اور ان کو پرائمری سطح پر لگایا جائے تاکہ معصوم ذہنوں کو بہتر ماحول میسر آئے۔ احساس ذمہ داری ان میں پیدا ہو۔ جب کہ حکومت سے یہ پروفیسر حضرات تنخواہیں پوری اور مراعات بھی لیتے ہیں اور سواریوں کو اپنی عدم دلچسپی کے باعث غلط منزل پر زبردستی اتار دیتے ہیں۔ جبکہ والدین سے فیس پوری وصول کی جاتی ہے۔

اگر ہمارے ہاں اس قسم کا ٹیکس سسٹم ختم کر دیا جائے یا بہت ہی کم کر دیا جائے تو میں اس بات کی گارنٹی دیتا ہوں کہ ان تھانے' کچہریوں کی ضرورت نہیں رہے گی۔

انسانی رشتے بھی ٹیکسی کی طرح استعمال ہوتے ہیں۔ ضرورت احتیاط برتنے کی ہے۔ کیونکہ انسان کا جسم بھی ٹیکسی کی مانند ہے جو ایک دوسرے کے استعمال میں آتا ہے۔

مادی ٹیکسی کی دوبارہ مرمت ہو جاتی ہے۔ بے کار ہونے کی صورت میں نئی خریدی جا سکتی ہے۔ ماڈل تبدیل کیے جا سکتے ہیں۔ لیکن انسانی وجود ٹیکسی کی شکل رکھتا ہے یہ بھی فور ویل ڈرائیور ہے۔ دونوں بازو اور ہاتھ جسم کے اگلے ویل ہیں۔

ٹانگیں اور پاؤں پچھلے ویل ہیں۔ دماغ سیٹ کا کام کرتا ہے۔ جہاں انسان بیٹھا ہوتا ہے وہ انمول ہیرا ہے۔ اگر ایک بار آپ کا چاہنے والا رخصت ہو گیا تو دوبارہ اس جیسا انسان پیدا نہیں ہو سکتا۔ آج کی جدید سائنس نے اتنی ترقی کر لی ہے۔ میرا اس سے سوال ہے کہ دو بھائیوں کی سوچ اور شکلیں کیوں ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں؟ پھر عادات و اطوار بھی؟ کہا جاتا ہے کہ سکریننگ کے ذریعے پہلے جیسا انسان پیدا کیا جا سکتا ہے تو لازمی نہیں کہ اسی میں وہی خوبیاں اور خصوصیات ہوں پھر وہی شکل وصورت ہو وہی شعور ہو کہ وہ اپنے عزیز و اقارب کو دنیا میں آ کر پہچان سکے پھر اس کو وہی ماضی ملے۔

وہی بات قابل فہم ہے کہ ہر انسان سے اسی کے معاملات میں علیحدہ علیحدہ پوچھ گچھ ہو گی۔ اگر وہی خصوصیات پیدا ہو جاتی ہیں تو آج کے انسان کو مسکین اور یتیم ہونے سے لاچار قوم ہونے سے بچایا جا سکتا ہے۔

پسماندہ ممالک میں ٹیکسی یعنی گاڑی چلانے کا کوئی خاص اصول نہیں۔ نہ کوئی اس کا حق اور فرض متعین ہے۔ جیسے ترقی یافتہ ممالک میں ہے۔ نہ ہوائی جہازوں کا راستہ مقرر ہے۔ یہ ڈرائیور کے رحم و کرم پر ہے کہ وہ مالک کو گاڑی کس حالت میں واپس کرتا ہے۔ گاڑی کا کرایہ مالک وصول کرتا ہے یا مرمت کا بل وصول کرتا ہے۔ سواری نے تو صرف منزل مقصود پر پہنچنا ہوتا ہے۔

ایک ادبی ڈیرہ اور مہمان شاعر کی آمد

ڈاکٹر جواز جعفری ''بساط''

ایک زمانہ تھا جب لاہور میں ادیبوں کے پاس گپ شپ کے لیے درجن بھر ٹھکانے تھے۔ مگر ایک ایک کر کے تقریباً سارے بند ہو گئے۔ کسی چائے خانے کو کسی پلازے نے نگل لیا تو کسی میں ٹائروں کی دکان کھل گئی۔ ٹی ہاؤس کی بندش کے بعد تو ادیب بالکل دربدر ہو گئے۔ ادیبوں کی فریادوں کے پس منظر میں ''چوپال'' نے جنم لیا اور بعد ازاں الحمراء ادبی بیٹھک وجود میں آئی۔ مگر بہت سے اہل قلم ادبی بیٹھک کے حوالے سے غیر یقینیت کا شکار ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ ساری رونق گورنر پنجاب جنرل خالد مقبول اور لاہور آرٹس کونسل کے سربراہ اصغر حسین گیلانی تک ہے۔ کیونکہ ادبی بیٹھک پر ادیبوں کے حق کا دعویٰ صرف زبانی کلام ہے۔ اس سلسلے میں کوئی ناقاعدہ ڈاکومینٹیشن نہیں ہوئی۔ اگر یہ سچ ہے تو پھر گورنر پنجاب اور اصغر گیلانی کو ادیبوں کے ان شک وشبہات کو دور کرنے کے لیے عملی اقدامات کرنے چاہئیں۔

لاہور میں اس وقت سب سے اہم ادبی مسئلہ ادیبوں کے مل بیٹھنے کی جگہوں کی کمی ہے۔ ایک طرف چائے خانے بند ہو رہے ہیں تو دوسری جانب اے۔جی جوش جیسے صاحب دل ادیب بھی ہیں جنھوں نے انارکلی کے قریب اپنے ماہنامے ''ادب دوست'' کے دفتر کو ادیبوں کا ادبی ڈیرہ بنا رکھا ہے۔ وہ بیشتر ادیبوں کی خوشیوں میں شریک ہونے کے بہانے ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ کوئی لاہوری ادیب بیرونِ ملک جائے یا امریکہ و یورپ کا کوئی اردو اہل قلم لاہور آئے تو وہ ان کے اعزاز میں کسی نہ کسی تقریب کا اہتمام کر لیتے ہیں۔ یوں لاہور کے ادیبوں کو چند لمحے اکٹھے گزارنے کا موقع مل جاتا ہے۔ جوش صاحب ان لوگوں میں سے ہیں جو دوسروں کو خوش دیکھ کر خوش ہوتے ہیں اور آپ تو جانتے ہیں کہ ایسے لوگ ہمارے معاشرے سے کتنی تیزی کے ساتھ ختم ہو رہے ہیں۔ گزشتہ دنوں انہوں نے ممتاز شاعر عرشیب بن عزیز' افتخار نسیم' ڈاکٹر امجد پرویز' خاور نعیم ہاشمی اور یاسر مقبول جان کے اعزاز میں ایک بڑا اکٹھ کیا تھا۔ اس تقریب میں شہزاد احمد سے لے کر احمد عقیل روبی' خالد احمد' نجیب احمد' بشریٰ رحمن' سلیمان سرور' اختر شمار' ناصر زیدی اور اشرف جاوید سمیت شہر کے چوٹی کے ادیب شریک ہوئے تھے۔ اس تقریب کی یادیں ابھی دلوں میں تازہ تھیں کہ کراچی سے ممتاز شاعر جاوید منظر آ گئے۔ چنانچہ ان کی آمد سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اے جی جوش نے ایک اور خوبصورت تقریب کا اہتمام کر ڈالا۔ جاوید منظر دراصل گجرات میں ایک مشاعرہ پڑھنے آئے تھے۔ ان کے ہمراہ کراچی ہی کی ایک اور شاعرہ رومانہ رومی بھی تھیں۔ واپسی پر دونوں نے لاہور کے دوستوں سے ملنے کے لیے دو دن تک یہاں قیام کیا۔ چنانچہ جوش صاحب کو تو موقع چاہیے تھا۔ انہوں نے جھٹ جاوید منظر کے اعزاز میں ایک خوبصورت تقریب سجا ڈالی۔ پہلے تو مہمان شاعر کے اعزاز میں ایک محفل مشاعرہ کا اہتمام کیا گیا تھا۔ جس میں ہمارے علاوہ ناصر زیدی' باقی احمد پوری' قائم نقوی' اختر شمار' عرفان صادق' رومانہ رومی اور اے جی جوش کے علاوہ بہت سے دوسرے شعراء نے اپنا

کلام سنانے کے علاوہ جاوید منظر سے ان کا ڈھیر سارا کلام سنا۔ بعد ازاں مہمان شاعر میں ایک خوبصورت عشائیے کا اہتمام کیا گیا تھا جس میں شہر کے اہم اہل قلب شریک ہوئے۔

جاوید منظر کا شمار ستر کی دہائی کے اہم شاعروں میں ہوتا ہے۔ وہ پروین شاکر' ثروت حسین' تاجدار عادل' ایوب خاور اور ابرار احمد کی نسل کے شاعر ہیں۔ جاوید منظر کے تین شعری مجموعے انہیں ادبی حلقوں میں اعتبار بخشنے کے لیے کافی ہیں۔ پہلا مجموعہ ''خوابِ سفر'' 1986ء میں شائع ہوا۔ جسے امریکہ کی لائبریری آف کانگریس نے تحقیق کے لیے منتخب کیا۔ 1996ء میں ان کا دوسرا مجموعہ ''بے صدا بستیاں'' اور حال ہی میں ان کی حمد و نعت کا مجموعہ ''میرے دل پر کعبے کا در کھلا'' شائع ہوا ہے۔ آخری مجموعہ ایک روحانی اور تخلیقی تجربہ ہے۔ اس مجموعے میں وہ حمد اور نعتیں شامل ہیں جو جاوید منظر نے وادیٔ حجاز میں اپنے چالیس روزہ قیام کے دوران کہیں تھیں۔ ان نعتوں میں ایک ایسی تڑپ اور عشق کی کشش ہے جو قاری کے دامن دل کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ جاوید منظر کا ایک اور کارنامہ پی ایچ ڈی کا وہ تحقیقی مقالہ (دبستان کراچی میں اردو غزل کا ارتقاء) ہے جو اپنی تکمیل کے قریب ہے۔ جاوید منظر کی آنے والی کتابوں میں ''ہر ایک چہرہ گلاب ہوگا'' ''ہمارے واسطے لہجہ بہت ہے'' ''دریارِ معصومیت'' اور ان کی یادداشتوں پر مشتمل کتاب 'دپس منظر سے منظر تک'' اہم ہیں۔ جاوید منظر دنیا بھر کے مشاعروں میں مدعو کئے جاتے ہیں اور اب تک امریکہ' انگلینڈ' ہندوستان' ایران' عراق' دبئی' اومان' ہانگ کانگ اور سعودی عرب میں منعقدہ مشاعروں میں شرکت کر چکے ہیں۔

جاوید منظر کی لاہور آمد سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایم اے او کالج لاہور کے ایم اے اردو کے طلبہ و طالبات نے بزم فیض کے زیر اہتمام ان کے ساتھ ایک خوبصورت مکالمے کا اہتمام کیا۔ اس نشست کی صدارت ڈاکٹر محمد عارف نے کی۔ جبکہ مہمان اعزاز جاوید منظر تھے۔ اس خوبصورت تقریب کے دوران ایم اے اردو کے طلبہ و طالبات نے مہمان شاعر سے ان کی زندگی اور تخلیقی کام کے حوالے سے نہایت فکر انگیز سوالات کئے۔ جاوید منظر نے اپنی گفتگو کے دوران سیماب اکبر آبادی' قمر جلالوی' زہرہ نگاہ' رضی اختر شوق' سحر انصاری' اقبال مجیدی' پیرزادہ قاسم' جون ایلیا' انور شعور' تاجدار عادل' ریحانہ روحی' سلیم کوثر کی تخلیقی کاوشوں کو دبستان کراچی کے لیے گراں قدر اثاثہ قرار دیا۔ اس مکالمے کے اختتام پر انہوں نے اپنا ڈھیر سارا کلام ادب کے سٹوڈنٹس کے نذر کیا۔ چند اشعار آپ کے لیے۔

نہیں کوئی جو دل کے ٹوٹ جانے کا سبب جانے
یہاں تو لوگ آنکھوں کی نمی پر غور کرتے ہیں

☆

بچھڑنا ہے تو مت الفاظ ڈھونڈو
ہمارے واسطے لہجہ بہت ہے

☆

ملے جو آبِ رواں لب نہ تر کروں گا میں
یہ معرکہ بھی اسی طرح سر کروں گا میں

☆

خاک میں مل گئے، بکھر بھی گئے
گلِ تازہ ۔جو ہم سے پہلے تھے

اسلام آباد کے علی یاسر کی گوجرانوالہ میں تقریب ملاقات

ذیشان رانا

گوجرانوالہ ادبی لحاظ سے بہت فعال شہر ہے۔ یہاں اکثر ادبی تقریبات منعقد ہوتی رہتی ہیں۔ جو اس شہر کی ادبی گہما گہمی کا ثبوت ہیں۔ جن تقریبات میں تو ہم خود شریک ہوتے ہیں۔ وہ تو ہمیں پتہ ہی ہوتی ہیں۔ دیگر تقریبات کے انعقاد کی خبریں پڑھ کر ان کا علم ہوتا رہتا ہے۔ پچھلے دنوں ہونے والی تقاریب میں سے ایک تقریب علی یاسر آف اسلام آباد کی گوجرانوالہ میں تقریب ملاقات تھی۔ جس کا اہتمام بزمِ حفیظ کے بانی پروفیسر فیض رسول فیضان نے کیا تھا۔ علی یاسر کافی عرصہ کے بعد گوجرانوالہ آئے تھے اور احباب سے ملاقات کا اہتمام پروفیسر صاحب نے کر دیا تھا۔ اس تقریب کی صدارت معروف فارماسسٹ گورایہ صاحب نے کی۔ جبکہ مہمان خصوصی علی یاسر اور ڈاکٹر سعید اقبال سعدی تھے۔ حرفِ آغاز پروفیسر فیض رسول فیضان نے ادا کیا اور علی یاسر کی موجودہ ذمہ داریوں اور ان کے نئے مجموعہ کلام کے متعلق بتایا۔ علی یاسر آج کل اکادمی ادبیات اسلام آباد میں ڈپٹی ڈائریکٹر ہیں اور ''ادبیات'' کی معاونت کر رہے ہیں۔ ان کا کلام پاکستان کے مؤقر اور معتبر جرائد میں چھپتا رہتا ہے۔ وہ اپنی نئی تخلیق کے متعلق گفتگو کرتے رہے۔ حاضرین کے اصرار پر انہوں نے اپنا کلام سنایا اور یوں یہ تقریب ایک مشاعرے کی شکل اختیار کر گئی۔ جس میں موجود تمام شعراء نے اپنا کلام سنایا اور خوب داد پائی۔ تقریباً بھی شعراء کے کلام میں حالات حاضرہ کی جھلک واضح تھی۔ جو اس بات کا ثبوت ہے کہ اہل قلم ملکی اور غیر ملکی حالات کا بغور جائزہ لیتے ہیں اور انہیں بھی اپنا موضوع بناتے ہیں۔ یہ تقریب تقریباً دو گھنٹے سے زائد جاری رہی۔ جس میں ڈاکٹر سعید اقبال سعدی نے علی یاسر کے متعلق گفتگو کی اور ان کے فن کو سراہا۔ انہوں نے بتایا کہ علی یاسر کی تخلیق کا پیش لفظ انہوں نے لکھا ہے۔ اس لیے وہ اب زیادہ گفتگو نہ کریں تو اچھا ہے۔ گورایہ صاحب نے علی یاسر کو جدید رنگ کا خوبصورت شاعر قرار دیا۔ یہ تقریب ملاقات اپنی انفرادی کی وجہ سے حاضرین کو مدتوں یاد رہے گی۔

ڈاکٹر سعید اقبال سعدی، علی یاس
فیض رسول فیضان، گورایہ صاح

ڈاکٹر انعام سعید خان

ڈاکٹر انعام سعید مرحوم کی آخری تحریر
خالد فتح محمد کے ناول ''پری'' پر ایک گفتگو

''پری'' خالد فتح محمد کا نیا ناول ہے۔ جو ان کے تین انسانوی مجموعوں ''داغ داغ اجالا'' ''جمع تقسیم'' اور ''5 منٹ کی زندگی'' کے بعد شائع ہوا ہے۔ خالد فتح محمد نے تھوڑے ہی عرصہ میں افسانہ نگاری میں اپنی شناخت بنالی ہے اور اب ناول نگاری کی طرف آئے ہیں۔ ناول لکھنا افسانہ لکھنے سے مختلف تجربہ ہے کہ ناول میں پوری زندگی سمٹی ہوتی ہے۔ ناول نگاری میں جو سب سے زیادہ بات دیکھنے میں محسوس ہوتی ہے۔ وہ جزئیات نگاری ہے اور بعض دفعہ ناول نگار جزئیات نگاری میں اتنا محو ہو جاتا ہے کہ قاری اکتاہٹ محسوس کرتا ہے اور کہانی اپنا تاثر کھو دیتی ہے۔ بانو قدسیہ کا ''راجہ گدھ'' اور فاروق خالد کا ناول ''سیاہ آئینے'' اس کی مثالیں ہیں۔ اس کے علاوہ مستنصر حسین تارڑ کا ''راکھ'' بھی اسی زمرے میں آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ''راکھ'' کے بجائے ان کے دوسرے ناول ''بہاؤ'' کو زیادہ پذیرائی ملی۔ جہاں انہوں نے جزئیات نگاری کا سہارا نہیں لیا۔ ''پری'' میں بھی خالد فتح محمد نے ناول کی ضخامت بڑھانے کے لیے جزئیات نگاری کا سہارا نہیں لیا۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ جہاں جزئیات نگاری ضروری ہے۔ ہم وہاں اس سے گریز کرنا یا چشم پوشی اختیار کرنا بھی ناول کے ساتھ ناانصافی نظر آئے گی۔ چونکہ فاضل ناول نگار تین افسانوی مجموعوں کے بعد ناول نگاری کی طرف آئے ہیں۔ لہٰذا کہیں کہیں ناول میں افسانوی رنگ نمایاں نظر آتا ہے اور جہاں جزئیات نگاری کی ضرورت تھی۔ وہاں خالد فتح محمد نے فلسفیانہ گفتگو کا سہارا لیا ہے۔ اسے ناول نگاری میں ایک نیا خوبصورت تجربہ بھی کہا جاسکتا ہے۔ یہی حال منظر نامے کے ساتھ ہوا ہے۔ منظر نامہ ناول کا اہم جزو ہوتا ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ ہرمن ہیسے کا ناول ''سدھارتھ'' گو ایک مختصر ناول ہے۔ لیکن ضروری مقامات پر ناول نگار نے خوبصورت منظر نامہ پیش کیا کہ قاری خود کو اس ماحول کا حصہ سمجھتا ہے۔ کم از کم مجھے ناول میں یہ کمی ضرور محسوس ہوتی ہے کہ قاری مناظر میں گم نہیں ہوتا۔

ناول کے مرکزی کردار معظم اور زہرہ جبیں کے ہیں۔ باقی تمام کردار ان دونوں کرداروں کو اجاگر کرتے نظر آتے ہیں۔ گو کسی بھی ناول پر چند لفظوں میں بات نہیں کی جاسکتی کہ ناول پوری زندگی ہوتا ہے۔ جس میں ناول نگار کا شعور اور صدیوں میں پھیلا ہوا لاشعور دونوں شامل ہوتے ہیں اور ناول نگار کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ لاشعوری کی تہوں میں اتر کر کہانی

کو اجاگر کرے اور اس کے کرداروں کی نفسیات کو نمایاں کرے۔ یہ ایک مشکل کام ضرور ہے۔
معظم خان ایک کامیاب صنعت کار ہے جس کی مصنوعات بیرونِ ملک اور اندرونِ ملک مقبول ہیں۔ معظم کی کامیا
کے پس پشت اس کا خاندانی نفسیاتی ردعمل ہے کہ اس کے پیچھے اس کے بڑوں کی منافقت' ریاکاری اور بے حسی چھپی ہو
ہے۔ یہ تینوں گُر ہے جو سرمایہ دارانہ نظام کا خاصہ ہیں۔ زیادہ سرمائے کے حصول کے لیے زیادہ بے حسی کی ضرورت ہوا
ہے۔ یہ بے حسی اس حد تک بڑھ جاتی ہے جہاں انسان دوسرے انسانوں کو چیزوں کی طرح استعمال کرتا ہے اور اپنی جنس
بھوک مٹانے کے لیے اسے عورت بھی محض ایک استعمال کرنے کی چیز ہی دکھائی دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ معظم خان کی زندگ
میں عورت اور شراب دونوں بھرپور طریقہ سے وارد ہیں۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ بازارِ حسن کا وجود اسی سرمایہ دارا
ذہنیت کی پیداوار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سعادت حسن منٹو نے یہ طوائف کے اندر چھپی ہوئی عورت کو نمایاں کیا جو ماں ہے، بیٹ
ہے، بہن ہے لیکن یہ خالد فتح محمد کی خوبی ہے کہ انہوں نے اپنے ناول میں عورت کے اندر چھپی ہوئی طوائف کا سراغ لگایا ہے
اور بازار حسن کا وجود جہاں سرمایہ دارانہ نظام کا شاخسانہ معلوم ہوتا ہے۔ وہاں عورت کی اپنی ایسی خواہشوں کی غمازی بھی کر
ہے۔ ناول کا کردار زہرہ جبیں اس کی ایک مثل ہے۔ جس کے اندر آگے بڑھنے کی خواہش چھپی ہوئی ہے اور جسے معظم علی کی
جہاندیدہ آنکھیں بڑی آسانی سے پڑھ لیتی ہیں۔
معظم علی کامیابی کی منزلیں طے کرتا ہے۔ اس کی شخصیت اور انا کی تکمیل ہوتی ہے۔ لیکن اس کی ذات کا کوئی حصہ
ادھورے پن کا شکار ہے۔ یہ ایک ایسا خلاء جو اس کے اندر موجود ہے اور اس خلاء کو فرزند قربان کی دوستی پورا کرتی نظر آتی
ہے۔ یہ محض معظم خان کا خیال ہے۔ لیکن بنیادی طور پر یہ فرد کی جنسی زندگی کا دوسرا درجہ ہے۔ جسے واضح طور پر اجاگر کیا جا
سکتا تھا کہ انسانی جنسی زندگی خود پسندی سے گزرتی ہوئی ہم جنسیت کی طرف آتی ہے۔ جسے خالد فتح محمد نے تین لائنوں میں
بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ اب مرحلہ نہیں ہے۔ جس سے سرسری طور پر گزرا جاسکے کہ یہ انسانی
زندگی کا اہم جزو ہے۔ شاہ حسین کی ساری زندگی مادھو لال سے وابستہ رہی۔ بعض لوگ یہیں سے روحانی تجربوں میں داخل
ہوتے ہیں چونکہ روحانی تجربہ معظم علی کو نہیں ہوسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ نفسیاتی تجربہ تک محدود ہے۔
انسانی زندگی میں کون سا ایسا لمحہ ہوتا ہے جب ایک عام عورت اسے دنیا کی خوبصورت ترین عورت نظر آتی ہے۔ وہ لمحہ
ابھی نگاہوں سے اوجھل ہے۔ وہ لمحہ پہلے سے موجود ہوتا ہے یا صدیوں کا سفر طے کرنے سے میسر آتا ہے اس کے متعلق کچھ
نہیں کہا جاسکتا اور یہ لمحہ معظم علی کی زندگی میں اس وقت آتا ہے جب وہ زہرہ جبیں کو دیکھتا ہے جو اسے ''پری'' دکھائی دیتی
ہے۔

''پری'' ایک ایسا تخیلاتی کردار ہے جو انسانی حواس کو سحر زدہ کردیتا ہے اور مرد پوری طرح اس کے قابو میں آجاتا ہے۔
یہی وجہ ہے کہ جب ایک عام عورت مرد کو پری اور اپسرا دکھائی دینے لگتی ہے تو زہرہ جبیں کو دیکھتے ہوئے معظم اس غلط فہمی سے
باہر نکل آتا ہے کہ فرزند قربان اس کی تکمیل تھا۔ بلکہ پری کو اپنی تکمیل سمجھتا ہے اور یوں جنسی زندگی تیسرے مرحلہ میں داخل

ہوتی ہے۔ جو مخالف صنف میں کشش کا باعث ہے۔

زہرہ جبیں اور معظم کے درمیان عمروں کا فرق موجود ہے۔ جب معظم اسے اپنے دفتر میں رکھ لیتا ہے تو زہرہ جبیں اپنی خداداد صلاحیتوں سے کم اور اپنے حسن کی بدولت اپنا مقام بنالیتی ہے اور معظم اپنی تکمیل کے لیے معزز حلقوں کی محفلوں میں زہرہ جبیں کو اپنے ساتھ ساتھ رکھتا ہے اور ہزہ جبیں اپنی شخصیت کی تکمیل میں یہ منزلیں طے کرتی ہے۔ اس سے پہلے ابرار سے زہرہ جبیں کا تعلق رہا۔ جو عمر میں اس سے بڑا تھا۔ یہ ایک عجیب نفسیاتی ردعمل ہے کہ زہرہ جبیں کو بلندی پر جانے کے لیے مضبوط معاشرتی کرداروں کی ضرورت پڑتی ہے۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ زہرہ جبیں کی محبت کا محور معظم ہو جاتا ہے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے معظم اور ہزہ جبیں اپنی اپنی بساط بچھائے بیٹھے ہیں اور وہ لاشعوری طور پر ایک دوسرے کو مات دینے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ معظم کا پری سے جسمانی تعلق ہونے کے باوجود ناول کے آخر تک اس کے سحر میں کھوئے رہنا اس بات کی غمازی بھی ہے کہ جسمانی ملاپ محبتوں کو تقویت تو ضرور دیتا ہے ختم نہیں کرتا اور یہ بات فرائیڈ کے نفسیاتی نقطۂ نگاہ کے خلاف جاتی محسوس ہوتی ہے۔ وقت کی بدلتی ہوئی رفتار میں انسانی' نفسیاتی اور فلسفیانہ نظریوں میں تبدیلی ناگزیر ہے اور اس بات کو سمجھانے میں خالد پوری طرح کامیاب دکھائی دیتے ہیں۔

ناول کا دوسرا باب ہمارے ملک کے سیاسی تناظر پر ایک طویل بحث یہاں آکر کہانی پر گرفت کمزور پڑتی دکھائی دیتی ہے اور نہ صرف کہانی پر گرفت کمزور ہوتی ہے بلکہ کرداروں کی مفاہمت بھی متاثر ہوتی ہے اور عبدالمجید کا کردار ایک ایسا کردار ہے جو ناول نگار کا ماؤتھ پیس محسوس ہوتا ہے۔ کردار محض کرسیوں پر پہلو بدلنے' سگریٹ پینے اور چائے پینے میں مشغول نظر آتے ہیں۔ اگر یہاں اختصار سے کام لیا جاتا تو میرا خیال ہے کہ قاری اکتاہٹ سے بچ سکتا تھا۔ لیکن یہاں ہمیں مصنف اپنی بات سمجھانے میں محو نظر آتا ہے اور یہی ایک کمزور پہلو ہے۔

معظم علی کی بیوی رخشندہ کا کردار سارے ناول میں ایک خاموش کردار ہے اور معظم علی سے مایوس بھی۔ اس کی یہی مایوسی مذہبی رجحان میں بدلتی ہوئی نظر آتی ہے۔ یہاں خالد فتح محمد نے مذہبی رجحان پر چند حرفوں میں بات کر کے دریا کو کوزے میں سمیٹنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ رخشندہ کے مذہبی رجحان پر چند لائنوں میں خوبصورت گفتگو فاضل مصنف کے وسیع مطالعہ اور گہری بصیرت کا پتہ دیتی ہے۔ یہ خوبی بہت کم ناول نگاروں میں دیکھنے میں آئی ہے۔ بانو قدسیہ کا ''راجہ گدھ'' سامنے رکھیں تو محسوس ہوتا ہے کہ اپنی بات سمجھانے کے لیے انہوں نے جن کرداروں کو ماؤتھ پیس بنایا انہوں نے لمبی گفتگو کا سہارا لیا۔ جس سے محض ناول کی ضخامت میں اضافہ کرنے کی خواہش بھی نظر آتی ہے۔

آخر میں مجھے یہ کہنا ہے کہ یہ ''پری'' اردو ادب میں ایک خوبصورت اضافہ ہے اور خالد فتح محمد نے 180 صفحات میں کچھ خوبصورت نئے تجربے کیے ہیں۔ جو ناول کی روایات سے ہٹ کر ہیں۔ اس میں انہیں کہاں تک کامیابی حاصل ہوتی ہے یہ فیصلہ وقت کے ہاتھوں میں ہے۔

تاثرات

خطوط

مکرمی جوش صاحب!

تسلیمات

فروری کے پرچے میں منیر نیازی پر متعدد مضامین شائع کر کے اپنے اس یار دلنواز کا حق ادا کر دیا ہے۔ اس حصے میں فرزانہ خان نیناں کا مضمون سب سے اچھا ہے۔ کرامت بخاری صاحب اور محترمہ نیلما درانی نے بھی منیر نیازی کو دردمندی سے یاد کیا ہے۔ عقیدت کے چراغ جلانے والوں کو اپنے چراغوں کی لویں اونچا رکھنے کا حق حاصل ہے اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ منیر نیازی اس دور کا بے حد مقبول شاعر تھا جو شاعر نظر بھی آتا تھا۔ اس کی شخصیت کی ساحری بے شمار لوگوں کو متاثر کرتی تھی۔ وہ معاصرین پر بے لاگ تنقید کرتا اور اپنے دل کی حقیقت کو پوری جرأت مندی سے پیش کرتا۔ آپ کے ایک مضمون نگار نے لکھا ہے:

> ''اکثر لکھنے والوں نے اسے ایک بڑا شاعر کہا۔۔۔ بعضوں نے اسے عصرِ حاضر کا سب سے بڑا شاعر قرار دیا ہے۔ کچھ ''صاحب الرائے'' ایسے بھی ہیں جن کے نزدیک وہ اردو کا سب سے بڑا شاعر ہے۔''

لیکن مضمون نگار نے یہ آراء پیش کرنے والوں کے نام نہیں لکھے۔ ان کا بیان مبالغہ آمیز ہے اور ''سند'' کے بغیر اس پر اعتراض واجب ہے۔ بیسویں صدی اقبال کے نام معنون ہو چکی ہے۔ انیسویں صدی غالب اور اٹھارہویں صدی میر تقی میر کے نام منسوب ہے۔ اس لیے جو شخص منیر نیازی کو اردو کا سب سے بڑا شاعر کہتا ہے اس کی رائے محلِ نظر ہے۔ منیر نیازی زندہ ہوتا تو اپنا مقام اور مرتبہ خود طے کرنے کے باوجود وہ اس بیان کی تردید کرتا۔ منیر نیازی کی وفات کے بعد کسی محروم شہرت حریص شاعر کو اس قسم کی بات نہیں کرنی چاہیے جو بے بنیاد ہو۔ اگر یہ حسرت ان کے اپنے دل میں پرورش پا رہی ہے تو وہ مختار ہیں کہ اپنے بارے میں جو جی میں آئے کہیں لیکن نا موسوم لوگوں سے اس قسم کی بات ہرگز منسلک نہ کریں جو ان کے اپنے باطن سے نکل رہی ہے۔ خدا کرے آپ بعافیت ہوں۔

والسلام، مخلص

انور سدید

O

محب و مکرم اے جی جوش! السلام علیکم

منیر نیازی کی یاد میں آراستہ ایک گوشے سمیت مختلف تخلیقات پر مشتمل ''ادب دوست'' ایک ہی نشست میں پڑھ چکا ہوں۔ جو احباب دنیائے علم و ادب کی سیاحی میں ایک زمانے سے مصروف ہیں اور علم و ادب کو اپنا ذریعہ معاش نہیں بلکہ اوڑھنا بچھونا سمجھتے ہیں اور اس کی افادیت سنجیدگی سے سمجھنے کی کوشش میں مصروف رہتے ہیں میں ایسے احباب کا بہت احترام کرتا ہوں۔ ادب دوست میں بھی ایسے احباب کی تخلیقات شائع ہوتی رہتی ہیں اور میں بہت شوق سے ان کا مطالعہ کرتا ہوں اور جتنا بن پڑے اپنی رائے کا اظہار بھی کرتا

ہوں۔ یہ رائے کبھی کبھار لائق تعزیر بھی قرار دے دی جاتی ہے۔ بہر حال اگر مجھے محترم احمد صغیر صدیقی ان معدودے چند افراد میں شمار نہیں سمجھتے جو شعر فہمی کے پراسرار عمل کا ساتواں در کھولنے کی اہلیت رکھتے ہیں تب بھی میں ان کا شکر گزار ہوں کہ اس سے مجھے ساتواں در کھولنے کی کوشش میں مصروف رہنے کی ترغیب ملتی ہے۔ میں شرمسار ہوں کہ میں نے ان کے شعر کو پیچیدہ سمجھا حالانکہ وہ ایسا مشکل شعر نہیں تھا۔ دسمبر ۲۰۰۷ء کے ادب دوست میں مذکورہ شعر کی صورت یہ تھی

اک سمت دیا ہے اور ہوائیں
اک سمت میں ہم، اُدھر رات

یہ شعر پڑھ کر اگر میں بات کو کہاں سے کہاں لے گیا تو بخدا تنقید برائے تنقید کے شوق میں نہیں لے گیا بلکہ شعر فہمی کے پراسرار عمل کا حصہ بننے اور ساتواں در کھولنے کی کوشش میں لے گیا تھا جس میں مجھے اس اعتبار سے کامیابی حاصل ہوئی کہ خود شاعر نے اس شعر کی ایک پرت کھولی اور مجھے شاعر کے تخیل کا تعاقب کرنے میں مزید احتیاط سے کام لینے کا سبق ملا۔ محترم منیر نیازی پر مضامین میں نے بہت شوق سے پڑھے اور مجھے اعتراف ہے کہ ہر مضمون نگار نے بہت خلوص اور محبت سے ایک عہد ساز شاعر سے اپنے دلی تعلق کا اظہار کیا۔ ایک بات پر البتہ حیرت ہے کہ فرزانہ خان نیناں کے علاوہ کسی مضمون نگار نے منیر کی شاعری پر تفصیلی گفتگو نہیں کی۔ جو اشعار بطور مثال پیش کئے گئے ان میں بھی زیادہ تر وہ تھے جو عوام الناس میں بھی مقبول تھے۔ میری دانست میں منیر نیازی کی شاعرانہ بصیرت کو نمایاں کرنے کے لئے ان کی فلمی شاعری سے بہت بہتر شاعری موجود ہے لہٰذا فلمی شاعری کی طرف ہلکا سا اشارہ کافی ہے جبکہ دیگر غزلیات اور آزاد نظموں پر زور دینا، ان کی پرتیں کھولنا اور ان کی گہرائی میں اترنے سے ہی منیر نیازی کے ساتھ انصاف کا کچھ حق ادا کیا جاسکتا ہے۔ ان کے درج ذیل اشعار ملاحظہ ہوں:

جو خبر پہنچی یہاں تک اصل صورت میں نہ تھی — تھی خبر اچھی مگر اہلِ خبر اچھے نہ تھے
اس لئے آئی نہیں گھر میں محبت کی ہوا — اس محبت کی ہوا کے منتظر اچھے نہ تھے

مجھ میں ہی کچھ کمی تھی کہ بہتر میں ان سے تھا — میں شہر میں کسی کے برابر نہیں رہا

ابھی ہے وقت چلو چل کے اس کو دیکھ آئیں — نہ جانے شمس رواں کب لہو اگلنے لگے

کس کو فکرِ گنبدِ قصرِ حباب — آبجو پیہم چلے، پیہم چلے

یہ چند اشعار دمِ تحریر، کلیاتِ منیر کے سرسری مطالعے سے سامنے آئے، پھر ان کے مجموعہ کلام "ایک دعا جو میں بھول گیا تھا" کی بے مثل نظمیں بھی نظر سے گزریں اور "تیز ہوا اور تنہا پھول" میں "صدا بصحرا" جیسی نظم بھی دیکھی جن سے اندازہ ہوا کہ ہمیں منیر نیازی کی فلمی شاعری کو وقتی طور پر بھول جانا چاہیے تا کہ ہم اردو کے بہترین شعرا کے ہم پلہ منیر کو دنیا سے متعارف کرا سکیں اور محترمہ اے

ہی جوش کا یہ دعویٰ بھی درست ثابت کر سکیں

شاعری میں اس کی جادو اور لہجے میں مٹھاس　　　شعر کی دنیا پر اس کا رنگ تھا چھایا ہوا

محترم کرامت بخاری چاہتے ہیں کہ منیر نیازی سے اپنی ذاتی ملاقاتیں اور تاثرات تفصیل سے لکھیں لیکن میرا خیال ہے کہ انہیں منیر کی شاعری پر بھی تفصیل سے لکھنا چاہیے ورنہ جو قرض' منیر ان کی جان پر چھوڑ گئے ہیں اسے چکایا نہیں جا سکے گا۔

اس بار محترم ظفر اقبال کی دونوں حمدیں پڑھ کر یہ اندازہ ہوا کہ اس صنف سخن میں جدت طرازی کی اور نئے راستے تلاش کرنے کی اب بھی بہت گنجائش ہے:

کہاں چھپا ہے اب جا کر　　　اپنا دیکھا بھالا تو
کیا کچھ کرتا رہتا ہے　　　ہم سے بالا بالا تو
آنکھیں ہیں تاریک فلک　　　اور آنکھوں کے تارے تم
نیند پڑی ہے مشکل سے　　　آؤ خواب کنارے تم

محترم ریاض حسین کی دو غزلہ کی صورت میں کہی گئی' دو نعتیں بھی متاثر کن ہیں

اتنی بھی خبر تم کو ستارو نہیں اب تک　　　کس خاکِ منور کی طلب گار ہیں آنکھیں

البتہ محترم جاوید منظر کی نعتوں میں عقیدت و محبت بے شک واضح ہے مگر جدت نہیں اور عقیدت و محبت کو واضح کرنا بھی کوئی آسان کام نہیں۔ آخر میں ڈاکٹر لبنیٰ سنبل کے مطلع کی داد دوں گا جس نے یہ ثابت کیا کہ اگر علامتیں بدل دی جائیں تو پرانے خیال میں بھی تازگی اور نیا پن پیدا ہو جاتا ہے۔ ذرا پرانا خیال ملاحظہ فرمائیے

جہاں بھونچال بنیادِ فصیل و در میں رہتے ہیں　　　ہمارا حوصلہ دیکھو ہم ایسے گھر میں رہتے ہیں

فقط' خیر خواہ

صامت وقار

O

مقام الاحترام جوش صاحب

السلام علیکم: خدا کرے آپ بعافیت ہوں

فروری ۲۰۰۷ء کا ادب دوست موصول ہوا۔ زیر نظر شمارہ منیر نیازی کے فن و شخصیت اور مختلف احباب کی ان کے حوالے سے یادداشتوں پر مشتمل تھا۔ یہ ایک مستحسن اقدام ہے۔ تمام مضامین وقعت کے حامل تھے۔ پسند آئے۔ اسی شمارے میں ظفر اقبال کی دو حمدیں شائع ہوئیں۔ ظفر اقبال کو میں بہت عرصہ سے پڑھتا آرہا ہوں۔ مجھے ان کی قدرت کلام میں کچھ کلام نہیں۔ مگر کچھ عرصے سے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ کہنے کے جنون میں شاعری کا خون کر رہے ہیں۔ ان کی حمد کا مطلع دیکھئے:

مسکینوں کے سہارے تم　　　اور سارے کے سارے تم

دوسرا مصرعہ نامکمل ہے۔ ترسیل ابلاغ کا فقدان ہے۔ چلیے ہم یہ سمجھ لیتے ہیں کہ شاعر یہ کہنا چاہ رہا ہے کہ اے پروردگار تم سارے کے سارے مسکینوں کے سہارے ہو۔ مگر خدا لگتی کہیے کیا شعری اسلوب اسی کا نام ہے۔ یہ تو ''نونہال'' یا ''تعلیم وتربیت'' میں چھپنے والی بچوں کی نظموں کی سطح کا شعر لگتا ہے۔ ایک اور شعر دیکھیے

نام ہی لیں تو آئے مزہ ایسے لگو کرارے تم

خدا کے لیے کرارے کا لفظ استعمال کرنا ظفر اقبال صاحب کو ہی زیب دیتا ہوگا۔ ہماری تو جان جاتی ہے۔ خاکم بدہن خدا کوئی اشیائے خوردن میں سے ہے کہ نام لیتے ہی منہ کا ذائقہ کرارا ہو جائے۔ یہ کیسی شاعری ہے۔ ایک اور شعر ملاحظہ فرمائیے

نیند پڑی ہے مشکل سے آؤ خواب کنارے تم

انصاف سے سوچیے' کیا یہ حمدیہ شعر ہے یا غزلیہ۔ ویسے بھی قرآن حکیم کی ایک آیت مع ترجمہ درج کر رہا ہوں

لا تدرکہ الابصار و ھو یدرک الابصار

(کسی کی آنکھیں اس کو نہیں دیکھ سکتیں اور وہ سب کو دیکھتا ہے)

اس آیت کے تناظر میں خدا سے خواب میں ملنے کی امید کرنا میری سمجھ سے بالاتر ہے۔ خدا کو دیکھنا یا اس سے ملنا تو دور کی بات ہے۔ وہ تو حد ادراک میں بھی مشکل سے آتا ہے۔ ایک اور حمد کا شعر اس طرح ہے

کیا کچھ کرتا رہتا ہے ہم سے بالا بالا تو

استغفراللہ۔ پہلی قرأت میں اس شعر کا مفہوم یہ بنتا ہے کہ خدا ہم سے بالا بالا کیا کرتا رہتا ہے۔ ہم سے پوچھ کے کیوں نہیں کرتا۔ یہ تو اسی طرح کی بات ہے کہ کوئی افسر اپنے ماتحت سے کہے میاں مجھے خبر ہی نہیں ہے اور تو مجھ سے پوچھے بغیر بالا بالا کیا کرتا رہتا ہے۔ کیا ایسا شعر حمدیہ شعر کہلانے کا مستحق ہے۔ کیا ظفر اقبال صاحب جیسے مستند اور پختہ کار شاعر کو حمد کہنے کے لیے یہی قرینہ میسر آیا ہے۔

ظفر اقبال صاحب سے میں نہایت ادب کے ساتھ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ میں تو ادب کا معمولی طالب علم ہوں میری بساط ہی کیا ہے۔ ظفر اقبال نے بہت لکھا ہے اور خوب لکھا ہے مگر ان کے مذکورہ بالا اشعار نے مجھے مایوس کیا اور میرے دل و دماغ پر ان کی شاعری کا جو سحر تھا' اسے مجروح کیا۔

منیر نیازی کے حوالے سے جمیل یوسف کا مضمون پسند آیا۔ جمیل صاحب کی نثر سادہ اور سہل ہونے کے ساتھ ساتھ ادبی رنگ کی حامل ہوتی ہے۔ اس لیے اپنا رنگ جماتی ہے۔

حسن عسکری کاظمی کا کہا درست ہے۔ ان کی نعت غلطی سے ڈاکٹر محمد رفیق کے حصے میں آ گئی۔ پچھلے دنوں ڈاکٹر صاحب کے فرزند عبدالوحید میرے پاس آئے تو میں نے اس ضمن میں اس سے استفسار کیا اور یہ پوچھا کہ کیا زیر بحث نعت رفیق صاحب کی بیاض میں موجود ہے۔ جواب نفی میں تھا۔

اجازت دیجیے' و' سلام

طالب انصاری

O

گرامی قدر اے جی جوش صاحب

تسلیم۔ ادب دوست ماہ فروری میں جناب منیر نیازی کی یاد میں جتنے مضامین شامل اشاعت کئے گئے سبھی خوبصورت اور معلومات افزا ہونے کے ساتھ تاثرات کے آئینہ دار ہیں۔ جمیل یوسف' فرزانہ خان' کرامت بخاری' نیلما درانی' عمرانہ مشتاق' جاوید صدیق بھٹی' زہیر کنجاہی اور سعید اقبال سعدی نے مختصر مگر بھرپور محبت سے معمور حرف تازہ کے ساتھ یادوں کو تازہ کیا۔ اسی طرح منظومات کی صورت میں اختر شمار' آپ' سلمان سعید اور عمران ہاشمی نے ماہ منیر کے لئے کہکشاں سجانے کا اہتمام کیا۔ یہ غم ابھی دل کو آزار پہنچا رہا تھا کہ جناب شریف کنجاہی کے مرنے کی خبر ملی۔ وہ جہلم میں میرے رفیق کار رہے۔ ہم نے گورنمنٹ کالج جہلم میں علمی اور ادبی سرگرمیوں کو بڑھاوا دینے میں باہمی اشتراک سے ادبی محافل سجائیں۔ شریف کنجاہی کبھی اردو غزل میں طاق تھے اور ان کا کلام معیاری ادبی جریدوں میں چھپتا رہا۔ ترقی پسند مصنفین تحریک سے بھی وابستہ رہے۔ ان دنوں میں ان کی غزل ظہیر کاشمیری کی رجائیت پسند طبیعت اوران کے شعری آہنگ سے مطابقت رکھتی تھی مثلاً شریف کنجاہی اور ظہیر کاشمیری کے درج ذیل اشعار میں کتنی مماثلت نظر آتی ہے

ہمیں یقیں ہے کہ وہ دن ضرور آئیں گے
یہ اور بات سہی ہم نہ دیکھ پائیں گے
(شریف کنجاہی)

ہمیں خبر ہے کہ ہم ہیں چراغ آخر شب
ہمارے بعد اندھیرا نہیں اجالا ہے
(ظہیر کاشمیری)

شریف کنجاہی نے پنجابی زبان وادب کی جتنی خدمت کی اسے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا' ہر لفظ کی پرکھ اور اس کے ماخذ سے متعلق ان کی معلومات عہد موجود کے ہر پنجابی لکھاری سے بڑھ کر تھیں' محترمہ افضل توصیف کا مضمون اعتراف عظمت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ان پر بہت کچھ لکھا جائے گا خصوصاً قرآن پاک کے پنجابی ترجے کو جتنی پذیرائی ملی وہ کسی اور کا مقدمہ نہیں بنی۔ وہ ہمارے دلوں میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

حسن عسکری کاظمی

O

محترم اے جی جوش صاحب

السلام علیکم

انتہائی افسوس کے ساتھ آپ کو اطلاع دے رہا ہوں کہ میری والدہ ماجدہ ۳ فروری ۲۰۰۷ء کو ۸۶ برس کی عمر میں قضائے الٰہی سے وفات پا گئیں۔

انا للّٰہ و انا الیہ راجعون

سروں سے دعاؤں کا شجر کٹ گیا' کیا عرض کروں آنسو ہیں کہ تھمتے ہی نہیں۔ ۶۶ برس کی عمر میں بچوں کی طرح بلک بلک کر رو رہا ہوں۔

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزہ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

دعاؤں کی التماس ہے۔

احقر
ریاض حسین چودھری

O

محترم جناب اے جی جوش صاحب

السلام علیکم۔ آپ کی خیریت کا طالب بخیریت ہے۔ خدا آپ پر اپنی رحمتیں نچھاور کرے (آمین)۔ ماہ فروری کا ''ادب دوست'' ملا شکریہ! محترم جناب حسن عسکری کاظمی صاحب کا خط پڑھا صورت حال سے آگاہی ہوئی۔ والد محترم جناب ڈاکٹر محمد رفیق صاحب اس دنیا میں نہیں ورنہ وہ اس کی رضاحت خود کرتے تاہم میں نے ان کی بیاض اور دیگر ذرائع سے معلومات کیں مگر یہ نعت سامنے نہیں آئی لہٰذا یہ غلطی سے ان کے نام سے شائع ہوگئی لہٰذا آپ اس نعتؐ کے متعلق وضاحت نذر قارئین کر دیں۔ میں ان کی ایک اور نعتؐ روانہ کر رہا ہوں امید ہے شامل اشاعت ہوگی۔

ماہ فروری کے شمارہ میں منیر نیازی کے متعلق مضامین اور خوبصورت شعر سامنے آئے۔ منیر نیازی کی شاعری اور شخصیت کے متعلق جتنا لکھا جائے کم ہے۔ برادرم کاشف بٹ نے والد محترم کے متعلق مضمون لکھا اور ان کی شاعری کے متعلق بھی اظہار خیال کیا میں ممنون ہوں۔

ادب دوست کے تمام رفیقوں کو سلام

والسلام
عبدالوحید
''فرزند رفیق''

ظفراقبال

☆

آون والا، جاون والا
روز گھڑی ترساون والا

اکھاں نوں چنگا ناں لگے
دل نوں ایڈا بھاون والا

کیہہ کجھ ظاہر باہر ہوی
اپنا آپ لکاون والا

ہو سکدا اے، آ سکدا اے
لکھی نوں بدلاون والا

لہر بہر جیہی کیوں سی اپنی
کون سی اوتھے آون والا

اگلی گل نوں کتھے پاوے
پچھلی گل مکاون والا

ہن آپے آوے تے آوے
ویہہ گیا وقت بلاون والا

ویلا ونڈ کے رکھی دا اے
رووݨ والا، گاون والا

باڑھ دے وچ ای جیوں کرٗ ظفرا
سو سواد اے ساون والا

☆

رُلدی وچ بزار کتاب
لیندے نہیں ادھار کتاب

آل دوالے ہوی آپے
رکھی ادھ وچکار کتاب

ورقہ ورقہ ہو کے اُڈ گئی
بدھی رُدھی پیار کتاب

چڑھدی رہی دماغ نوں سدھی
چھکدے رہے نسوار کتاب

پہلی وار سی کلم کلی
نال سی دوجی وار کتاب

عقلوں ہولا ای رہساں میں
چکی پھرساں بھار کتاب

کسے نوں سار ای نہیں سی ہوئی
آر توں ہو گئی پار کتاب

چلی واہ تے راضی ہوئی
نکلی اندروں باہر کتاب

پڑھیوں باجھ ای لگی ظفرا
ایڈی چسکے دار کتاب

آغا شاہد

عشق دی سولی

محبت کیہ ہوندی اے عندلیب نوں بالکل وی پتہ نہیں سی اوہ اپنے ماں باپ دی اکلوتی لاڈلی بیٹی سی۔ گھر وچ وڈے دو بھائی جیہڑے اپنی دنیا وچ مگن۔ باہر دی دنیا توں عندلیب بالکل ناواقف سی۔ لاڈاں وچ پلی عندلیب ہن بی اے دی طالب علم سی پر اوہدیاں گلاں اج وی چھوٹے بچیاں ورگیاں سن۔ لاڈ پیار نے اوہنوں Mature نہیں ہون دتا۔ عندلیب دی دوستی اپنے ای خاندان وچ صرف اپنی کزن جیہڑی اوہدے چاچے دی بیٹی سی اوہدے نال سی۔ ویسے تے اوہ عمر وچ عندلیب نالوں کوئی چھ سال وڈی سی پر ہون اوہ عندلیب نوں ماں ونگروی پیار کردی تے اک چنگی سہیلی والیاں ساریاں خوبیاں اوہدے وچ سن۔ جوں جوں عندلیب نے جوانی وچ قدم رکھیا توں توں اوہدی بے چینیاں تے بے قراریاں ودھ دیاں گیاں۔ اوہ ہر ویلے اپنے آپ وچ گواچی رہندی۔ اکثر عندلیب گھر دے کوٹھے تے چلی جاندی تے خموشی نال آسمان ول ویکھدی تے خورے کیہڑی دنیا وچ نکل جاندی۔ اوہ اج وی بھولی بھالی تے معصوم کڑی سی۔

عندلیب دے والد اکثر بیمار رہندے تے چاہندے سی کہ میری زندگی وچ اپنی بیٹی دی شادی کر دواں۔ پر عندلیب اہناں ساریاں گلاں نوں جاندے ہوئے ذہنی طور تے شادی واسطے بالکل تیار نہیں سی۔ گھر وچ عندلیب دے ویاہ دیاں گلاں ہون لگ گیاں۔ عندلیب نال جدوں وی کوئی ویاہ دی گل کردا اوہ چپ کر کے ساریاں دی سن لیندی۔

عندلیب دی پھوپھی دا بیٹا جیہڑا عندلیب نوں بہت پسند کردا سی جدا ناں سہیل سی۔ فوج وچ کپتان سی۔ سہیل اک خوبرو نوجوان سی تے عندلیب دے والد دی خواہش سی کہ سہیل نال عندلیب دا ویاہ ہو جاوے جد کہ سہیل وی ایہو چاہندا سی۔ گھر والیاں دا خیال سی کہ گھر دا بچہ اے تے ساڈی اکلوتی تے لاڈلی بیٹی نوں وی خوش رکھے گا۔

عندلیب دی اک سہیلی جیہڑی اوہدے گھر دے کول ای رہندی سی اوہدے نال اے ساریاں گلاں کردی۔ عندلیب دی اکثر ملاقات اپنی سہیلی دے بھائی جداناں ارسلان سی ہو جاندی۔ اوہ دل ای دل وچ ارسلان نوں پسند کرن لگ پئی تے ایہہ سوچدی کہ میری دوستی ارسلان نال نہیں ہوسکدی ارسلان بہت سادہ تے سمجھدار منڈا اسی۔

اک دن عندلیب نے شہلا نوں فون کیتا تے ارسلان نے فون چکیا جدی آواز سن کے عندلیب دل وچ خوش ہوئی تے سلام دعا توں بعد اوہدے نال ای گلاں کرن لگ گئی۔ تھوڑی جہی گل بات کرن نال عندلیب نوں لگیا کہ جویں ورھیاں دی دوری اک پل وچ مک گئی۔ عندلیب ہن اکثر اوسی ویلے شہلا نوں فون کردی جدوں شہلا گھر نہ ہوئے تے ارسلان نال گلاں کردی۔ ہن ارسلان نال دوستی دن بدن وددی جا رہی سی۔ عندلیب ہر ویلے ارسلان دے خیالاں نال گلاں کردی۔ ایس دوران عندلیب دے رشتے دی گل کیپٹن سہیل نال پکی کرن دا پروگرام بن گیا۔ دووئیں خاندان ایس رشتے توں بہت خوش سن۔ پر عندلیب اندروں بالکل وی خوش نہیں سی۔ پر اپنے بیمار پیو دی خوشی تے خاندان والیاں دیاں خوشیاں دی خاطر اپنی خوشی قربان کرن لئی تیار ہوگئی۔ عندلیب نے اج اپنی کزن نو گھر بلایا تے اپنے دل دیاں ساریاں گلاں کیتیاں کہ میں انجے ویاہ نہیں کرنا چاہندی۔ کسے طرح ایہہ شادی روک دیو۔ عندلیب نے اپنی کزن دیاں بہت منتاں کیتیاں۔ اوہدی کزن کہن لگی ویکھ عندلیب اخیر اک دن تے ویاہ کرنا ای اے تے نالے کڑیاں اپنے گھر دیاں ہو جان سب نالوں چنگی گل ایہو ہوندی اے۔ نالے منڈا اوی گھر دا اے۔ سارے گھر والے ایس رشتے توں خوش نیں۔ عندلیب نے کزن نوں پوچھیا کی تسی وی خوش او۔ کزن نے آکھیا ہاں ایس نالوں چنگا ہور کیہڑا رشتہ ہوسکدا اے۔ اوہ سارے گھر والے تیرے نال بہت محبت کردے نیں۔ تیری ہر خوشی دا خیال رکھن گے۔ ماپیاں دی زندگی توں بعد خون دے رشتے دی اپنے نہیں بندے بہتر اے وے کہ توں ہاں کر دے۔ ویا توں بعد ہر چیز ٹھیک ہو جاوے گی۔ اج عندلیب اندروں ٹٹ گئی سی۔ جیہڑی اپنی کزن نوں اپنا آئیڈیل سمجھدی تے اوہدے تے بڑا مان سی اوہ سارا مان اج ٹٹ گیا سی۔ اج اوہدیاں اکھیاں وچ بے اختیار اتھرو آ گئے۔

اخیر عندلیب دی پھوپھی اپنے پتر کیپٹن سہیل نوں لے کے لاہور آ گئی تے منگنی دا دن رکھ دتا گیا۔ ویکھدے ای ویکھدے عندلیب دی انگلی وچ سہیل دے ناں دی انگوٹھی لشکاں مار رہی سی۔ اوہ دوہٹی بنی اپنے ارسلان نوں یاد کر رہی سی۔ اوہنوں اپنے موبائل توں کتے ایہہ message ارسلان نوں کر چھڈے۔ سارے لوکی خوشیاں منا رہے سی سہیل دی خوشی نال پاگل سی تے کن اکھیاں نال عندلیب دی دلکشی تے خوبصورتی دیکھا اینج لگدا سی کہ اوہنوں دنیا دا قیمتی خزانہ مل گیا۔ سہیل عندلیب نال مذاق کرن دی کوشش کردا پر عندلیب بہت serious سی کیونکہ اوہ کسی ہور دے خیالاں نوں دل وچ وسائے بیٹھی سی۔ ارسلان نال اوہدیاں ملاقاتاں دا سلسلہ پہلے توں زیادہ ہو چکیا سی پر ارسلان ہر ملاقات تے عندلیب نوں نصیحتاں

کردا تے مرداں دی ذہنیت بارے دسدا۔ دل ای دل وچ اے وی سوچدا کہ جدوں عندلیب اپنے گھر چلی گئی تے میں کیہ کراں گا۔ اوہ ہن پرائی ہو چکی سی۔ مینوں صرف اوہدی خوشی دا خیال کرنا چاہیدا اے۔ پورے خاندان دیاں خوشیاں عندلیب تے سہیل دی شادی نال وابستہ نیں۔ ارسلان عندلیب دی خواہشاں دا اینا خیال رکھدا کہ وہ بھل گیا سی کہ اوہ تے کسی ہور دی امانت اے۔ ارسلان دن بدن اندروں ٹٹدا جا رہیا سی پر کسی نوں ظاہر نہ کردا۔ اخیر اوہ ویلا وی آ گیا جدوں عندلیب دوہٹی بن کے سہیل دے گھر چلی گئی۔ کیپٹن سہیل دی محبت تے اوہنوں مل گئی سی۔ پر عندلیب نے اسلام آباد پہنچ کے سب توں پہلاں ارسلان نوں فون کیتا کہ ایتھے میرا دل نہیں لگ رہیا۔

سہیل کمرے وچ دلہا بنیا داخل ہویا تے اپنی الماری کھولی تے اوتھوں شراب دی بوتل کڈھ کے عندلیب دے سامنے بیٹھ گلاس وچ شراب پائی تے پین لگ گیا۔ سہیل نے رج کے اج شراب پیتی۔ عندلیب نے زندگی وچ پہلی واری شراب ویکھی سی۔ سہیل شراب دے نشے وچ عندلیب دے حسن دیاں تعریفاں کر دا رہیا۔ ویاہ توں دو دن بعد عندلیب اپنے گھر آئی سی۔ ادھی کزن نے بڑے پیار نال اوہدا حال پوچھیا تے عندلیب اوہدے گلے لگ کے زاروقطار رون لگ گئی۔ وقت لنگدا گیا تے عندلیب دی نفرت سہیل نال ودھدی گئی۔ اک دن عندلیب نے مجبور ہو کے سہیل نوں شراب پین توں منع کیتا تے سہیل نے غصے وچ آ کے اوہدے منہ تے زوردار تھپڑ دے ماریا۔ عندلیب بہت پریشان سی تے موقع ملدے ای ارسلان نوں فون کیتا کہ میں سہیل نال نفرت کردی آں۔ مینوں خدا دا واسطہ ایتھوں لے جا۔ ارسلان دے وس وچ کجھ نہیں سی۔ عندلیب دے فون توں بعد اوہ بہت پریشان ہو گیا۔ اج دی رات ارسلان لئی اک صدی تے محیط سی۔ اوہ چھیتی نال عندلیب کول جانا چاہندا سی۔ ساری رات پریشانی وچ ای گزر گئی۔ اج خیر ارسلان نوں عندلیب دا فون آ گیا۔ اوہ تے رو رو کے ارسلان نو بلا رہی سی پر ارسلان دل تے پتھر رکھ کے اوہنوں دلاسہ دیندا کہ تیرا خاوند تیرے نال بہت پیار کردا اے۔ اوہ اپنی محبت دی خاطر ضرور بدل جائے گا۔ توں صبر نال کم لے۔ پر عندلیب دی بے چینی دن بدن ودھدی گئی۔ اوہنے ہر گل اپنے دل نال لا لئی۔ اوہ سمجھن لگ گئی کہ دنیا وچ کوئی وی اوہدے نال پیار نہیں کردا۔ سارے اپنی خوشی چاہندے نیں۔

اج عندلیب نے غصے وچ سہیل دی لیائی ہوئی شراب دی بوتل اوہدی غیر موجودگی وچ توڑ دتی سی۔ سہیل آیا تے عندلیب دی ایہہ حرکت ویکھ کے اگ بگولا ہو گیا۔ عندلیب نوں گڈی وچ بٹھایا تے کلب لے گیا۔ اوتھے ویسے عندلیب نوں سوئمنگ کرن دا آرڈر دتا جدوں عندلیب نے انکار کیتا تے ایہہ کہیا کہ مینوں پانی توں ڈر لگدا اے تے سہیل نے عندلیب نوں پانی وچ سٹ دتا۔ عندلیب چیکاں مارن لگ گئی۔ تے سہیل زور زور دی ہسن لگ گیا۔ عندلیب نے جدوں ہور زور دی چیخ ماری تے سہیل نے پول وچ جا کے اوہدے منہ تے زور دی تھپڑ ماریا۔ عندلیب دا ساہ بند ہو گیا تے سکتے وچ آ گئی۔ سہیل

نے جدوں عندلیب دی حالت serious ویکھی تے جلدی نال پانی وچوں باہر کڈیا تے اوہدے پیری پے گیا تے کیندا رہیا کہ مینوں معاف کردے میں تیرے نال بہت محبت کرداواں۔

اج شادی نوں تین مہینے لنگ گئے سی عندلیب نے اخیر سہیل نوں کہہ دتا کہ میں تیرے نال نفرت کردی آں میں تیرے نال نئیں رہنا چاہندی۔ توں مینوں میرے گھر لاہور بھیج دے۔ سہیل دے دل وچ کی آیا کہ اوہ عندلیب نوں گڈی وچ بٹھا کے لاہور لے آیا۔ لاہور پہنچدے ای عندلیب دی طبیعت اچانک خراب ہو پئی تے اوہ کھچ کھچ کے ساہ لین لگی۔ تے ماں ماں کہندی گئی۔ سہیل اوہنوں سدھا CMH لاہور لے گیا۔ ہالے ڈاکٹر عندلیب نوں ویکھ ای رہی سی کہ عندلیب نے اک لمبا ساہ لیتا۔ ڈاکٹر کمرے توں باہر آیا تے سہیل نال sorry کیتا۔ عندلیب ہسپتال دے بیڈ تے بے حس و حرکت پئی سی۔ اوہدیاں کھلیاں اکھاں اج وی کسے دی اوڈیک وچ سن۔ سہیل عندلیب دے کول گیا۔ اوہدے ہتھ وچ موبائل ویکھیا۔ عندلیب موبائل توں کوئی نمبر ڈائل کرن دی کوشش کر رہی سی۔ سہیل نے اوہ نمبر ڈائل کیتا تے اوہ ارسلان دا نمبر سی۔ ارسلان نے فوراً فون سنیا۔ سہیل نے ارسلان نوں چھیتی نال ہسپتال آن دا کہیا۔ ارسلان اپنی بھین دے نال CMH پہنچ گیا۔ سہیل نے ارسلان ول ویکھیا تے کہن لگا ظالما جے توں عندلیب نال اینا پیار کرداسی تے فیر عندلیب دی حالت دا ذمے دار وی توں ایں۔ کیونکہ میں ساریاں غلط حرکتاں عندلیب دا پیار نہ پان دی وجہ نال کیتیاں۔ تے سہیل پھٹ پھٹ کے رون لگ گیا۔ عندلیب مینوں معاف کردے۔ میں تیرے عشق وچ پاگل ہو گیا سی۔ میری عندلیب نئیں مرسکدی۔ توں نئیں مرسکدی۔ سہیل دا اے رونا ویکھ کے ارسلان اپنے آپ توں شرمندہ دکھ دی تصویر بنیا بیٹھا اپنے آپ نوں کہہ رہیا سی کاش اے عشق دی سولی میں چڑھ جاندا۔
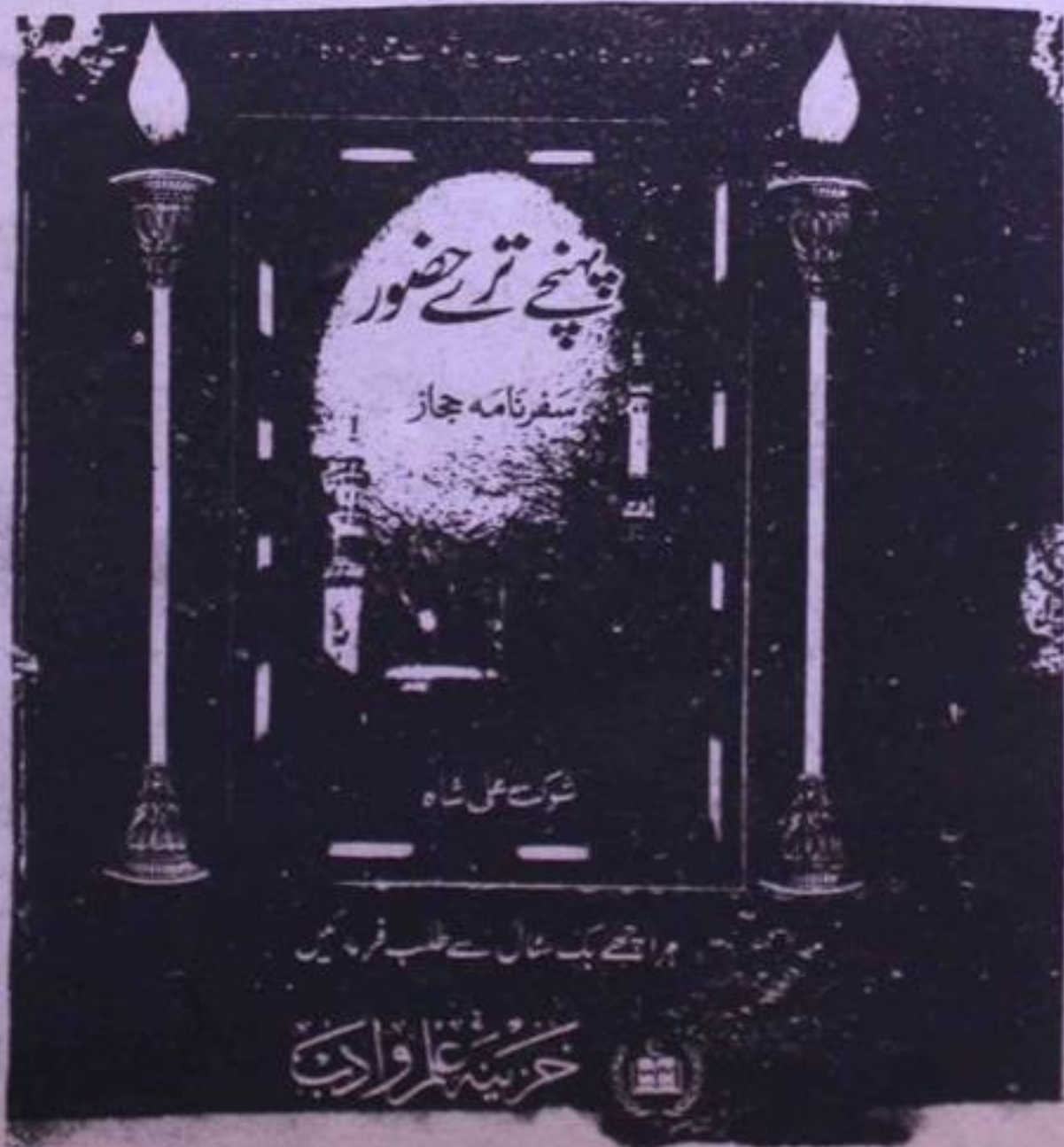
فرخ زہرا گیلانی

خالد احمد

ڈاکٹر اجمل نیازی

اے جی جوش

Monthly **ADAB-DOST** LAHORE

Regd. L No. 117
مارچ ۲۰۰۷ء